لدھیانوی
مرتبہ سرور شفیع

"ساحر کو قارئین کی جانب سے جس قدر پیار ملا ہے وہ اپنے نظریات کے ساتھ سچی پکی "کمٹمنٹ" کے باعث ملا ہے۔ ساحر واحد شاعر ہے جس نے منافقت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سمجھوتہ نہیں کیا۔ نظم، غزل کے علاوہ اُس نے فلمی گیتوں میں بھی اپنے فلسفے اور نظریات کو پیش نظر رکھا ہے۔"

مخدوم محی الدین ______

"ساحر کا فن ادب کے اس بلند نصب العین کا عکاس ہے جو جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کی تفریق سے بالا ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کا شاعر ہے۔ بدلتی ہوئی تاریخ کے ہم رکاب اُسکی شاعری ہیئت اور فکر کے نت نئے خاکے مرتب کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تر شعرا میں سے قارئین اسے سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔"

سید احتشام حسین ________

"ساحرؔ، شاعری کی فطری صلاحیت اور بے دریغ قوت لے کر آئے ہیں۔ وہ چاہے غزل کہیں چاہے نظم، چاہے غزل نما نظم لکھیں یا نظم نما غزل، وہ ہر صورت شاعری کا پورا حق ادا کرنے کی قابلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے کہ وہ خارجی عوارض اور داخلی تاثرات کو سلیقے کے ساتھ سمو کر ایک آہنگ بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔"

——— فراقؔ گورکھپوری

ساحر لدھیانوی

کا

غیر مطبوعہ کلام

مرتب

سرور شفیع

ساحر پبلشنگ ہاؤس
"پرچھائیاں" - اے بی نائر روڈ - جوہو چرچ —— ممبئی ۴۹...۴

ضابطہ

- بارِ اول نومبر سنہ ۱۹۹۸ء
- سرورق انور سلیم
- تزئین ہرجیت سنگھ سوہی
- زیرِ اہتمام کلیم راہی
- طباعت ادبی پرنٹنگ پریس۔ ۸ شیفرڈ روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸ فون ۳۰۱۰۲۱۹

قیمت ۱۵۰ روپے
بیرون ملک ۱۵ امریکی ڈالر

سرور شفیع

ناشر

ساحر پبلشنگ ہاؤس، پرچھائیاں، اے بی نائر روڈ، جُوہو چرچ، ممبئی ۴۰۰۰۴۹ ★ فون ۶۲۰۲۸۳۷

یہ مرے شعر مرے آخری نذرانے ہیں!

——— ساحر

فہرست

عنوان	صفحہ
پڑھنے والوں کے نام - سرور شفیع	۶
ساحر لدھیانوی - اے حمید	۱۴
حمد	۶۰
حُسنِ فطرت	۶۳
بھجن	۶۵
میری سُن لے عرض	۶۷
بھجن	۶۸
ہے رُوم رُوم میں	۷۰
محفلِ رقص و سرود	۷۱
ترانۂ حریت	۷۳
ورثہ	۷۴
وطن کی آبرو	۷۸
نوحہ	۸۰
ماں	۸۲
راہبر کیسے کیسے	۸۶
کِس کے لئے	۸۸
ہم سر بکف اُٹھے ہیں	۸۹
آج اِس درجہ	۹۱
دل کی داستاں	۹۳
پھولوں کے بسنتی گہنے	۹۵
پیار کر لیا تو کیا	۹۷
انتظار	۹۸
محبّت کا تعلق	۱۰۰
یہ آنکھیں دیکھ کر	۱۰۲
جو ہم میں ہے	۱۰۳
جیو تو ایسے جیو	۱۰۵
بے تعلق سی ملاقات	۱۰۷
آپ آئے تو	۱۰۸
کرشن پھر آئیں گے	۱۱۰
آزاد وطن کو دیکھ ذرا	۱۱۳
الوداع	۱۱۵
بس اِتنا ہی	۱۱۷
آج کا پیار	۱۱۸
نظارے ہم کیا دیکھیں	۱۲۰
بھیگی بھیگی رات	۱۲۱
انصاف کا ترازو	۱۲۳
جنگل کے لوگ	۱۲۶
بستی بستی	۱۲۸

عورت	۱۳۰
اب اگر ہم سے	۱۳۲
تیری جوانی	۱۳۳
اُس ریشمی پازیب	۱۳۴
اب چاہے ماں رُوٹھے	۱۳۵
یہ دل تم بن	۱۳۷
برباد محبت کی دُعا	۱۳۸
تیرے در پہ آیا ہوں	۱۳۹
دل خوش ہے	۱۴۰
زندگی ہنسنے گانے کے لئے	۱۴۱
مسیح پاک رُوح تھے	۱۴۲
ہر طرف حُسن	۱۴۴
دل میں کسی کے پیار	۱۴۶
دنیا کرے سوال	۱۴۷
پیار کا تحفہ	۱۴۸
سمٹی ہوئی یہ گھڑیاں	۱۵۰
کس کا رستہ دیکھے	۱۵۱
نکلے تھے کہاں جانے کے لئے	۱۵۳
مرگھٹ کی سرزمین سے	۱۵۴
حُسن حاضر ہے	۱۵۸
تجھ کو رکھے رام	۱۵۹
کبھی کبھی مرے دل میں	۱۶۰

پڑھنے والوں کے نام!

آج جب میں اپنے مرحوم بھائی ساحر لدھیانوی کے غیر مطبوعہ کلام کی یہ کتاب مرتب کر رہی ہوں تو یادوں کا ایک اژدہام ہے جس نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور میں یہ طے نہیں کر پا رہی ہوں کہ اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔

ساحر لدھیانوی بلاشبہ ایک باکمال شاعر تھے۔ یہ بات میں اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ مشہور نقاد انور سدید صاحب نے ساحر کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔ "ساحر عظیم شاعر نہیں تھے لیکن ان سے مقبول ترین شاعر ہونے کا اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا۔"

اس ضمن میں میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ بھائی ساحر نے ۲۰ سال کی عمر میں 'تاج محل' جیسی جذباتی نظم لکھ کر عوام کی جو محبت حاصل کی تھی، وہ آج بھی جوں کی توں مہک رہی ہے اور ان کے چرچے رواں دواں ہیں۔

بھائی ساحر کی مقبولیت کا ایک اور زندہ ثبوت یہ ہے کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "تلخیاں" کے پچاس سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اس کی مثال پچھلے سو سال کی اردو تاریخ میں نہیں ملتی۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری کی جعلی کتابیں، درجنوں کے حساب سے چھپتی رہتی ہیں۔

ان سب کتابوں کی تفصیل تو اس وقت میرے پاس موجود نہیں

ہے لیکن چند کا تذکرہ میں ضرور کروں گی کہ یہ تمام جعلی کتابیں، میری اجازت کے بغیر چھپی ہیں اور ان کتابوں کے نام نہاد پبلشروں میں سے کسی نے بھی مجھے یا ساحر پبلشنگ ہاؤس کو کوئی رائلٹی ادا نہیں کی ہے۔

حیدرآباد کے حسامی بکڈپو نے ۱۹۹۴ء میں 'کلیاتِ ساحر' کے نام سے ایک ضخیم کتاب چھاپی اور پبلشر صاحب کی جہالت دیکھئے کہ اس میں مجروح سلطانپوری، راجندر کشن اور ساحر ہوشیارپوری کا کلام بھی شامل کر دیا۔

امرناتھ دہلوی نے ۱۹۹۶ء میں "ساحر کی شاعری" کے نام سے ان کے انتخابِ کلام کی اردو۔ ہندی میں دو دو کتابیں مرتب کر دیں جنہیں ہندی بک سینٹر نئی دہلی اور ڈائمنڈ بکس نئی دہلی نے ۱۹۹۴ء میں چھاپا۔

ان ہی لوگوں نے ۱۹۹۷ء میں ہندی میں "تلخیاں" کا جعلی ایڈیشن شائع کیا۔ اتنا ہی نہیں اسٹار پبلی کیشنز نئی دہلی نے 'تلخیاں' کو جعلی قلم کی کتابیں سیریز میں برطانیہ اور غیر ممالک کے لیئے شائع کیا۔ ساتھ ہی" پل دو پل کا شاعر ہوں" کے عنوان سے بھائی ساحر کا کلام نئے انداز سے چھاپ دیا جبکہ اس نام سے بھائی ساحر کا کوئی مجموعۂ کلام ہے ہی نہیں۔

ان کے علاوہ دہلی کے ساقی بکڈپو نے بھی 'تلخیاں' اور 'تنہائیاں' کے نام سے دو جعلی کتابیں چھاپیں جبکہ 'تنہائیاں' کے نام سے بھائی ساحر کی کوئی کتاب نہیں ہے۔

یہ تو تھی ہندوستان کی بات۔ پاکستان بھی بھائی ساحر کی جعلی کتابیں چھاپنے کی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہا۔ وہاں بھی لگ بھگ ڈیڑھ درجن کتابیں چھاپی گئی ہیں۔ لیکن میں ان میں سے اب تک صرف تین کتابیں ہی منگوا پائی ہوں۔

پہلی کتاب کلیاتِ ساحر ہے جسے لاہور کے الحمد پبلی کیشنز نے ۱۹۹۵ء میں بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے اور اس کی قیمت دو سو روپے ہے۔ اسی ادارے نے جعلی طور پر 'تلخیاں'، 'آؤ کہ کوئی خواب بُنیں'، 'گاتا جائے بنجارہ' اور 'تنہائیاں' بھی چھاپی ہیں جبکہ یہ بھائی ساحر کی طویل نظم 'پرچھائیاں' ہے۔

لاہور کے سنگ میل پبلی کیشنز نے بھی 'بنجارے کے خواب' کے عنوان سے تاج سعید کی مرتب کردہ کتاب کے دو ایڈیشن چھاپے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں اور دوسرا ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔

'سارے خواب خاک ہوئے' کے عنوان سے مکتبہ القریش' لاہور نے بھی ایک جعلی کتاب چھاپی جو ضیاء ساجد کی مرتب کردہ ہے۔

پاکستان میں یہ ساری کتابیں ۱۹۸۵ء میں ساحر پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام شائع ہونے والے 'فن اور شخصیت' کے 'ساحر لدھیانوی نمبر' کے بعد چھپی ہیں اور چربہ سازوں نے اس نمبر سے بھرپور فیض اٹھایا ہے۔ بہرحال یہ بھائی ساحر کی شہرت اور مقبولیت کا زندہ دستاویزی ثبوت ہے۔

ہے کوئی ایسا جدید شاعر جس کے ساتھ ایسا ہوا ہو یا ہو سکتا ہو؟ نہیں ہے۔ ورنہ بھائی ساحر کی طرح اس کے بھی مجموعۂ کلام کے جعلی ایڈیشن چھپ جاتے۔

بھائی ساحر کو ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد جس طرح سے سرکاری اور عوامی اعزازات سے نوازا گیا اس کی مثال بھی کسی اور شاعر یا ادیب کی زندگی میں نہیں ملتی۔ بھائی ساحر کو ۱۹۷۱ء میں حکومت ہند کی طرف سے پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ روس نے سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ دیا۔ اس کے علاوہ ادر دو اکیڈمی ایوارڈ، مہاراشٹر اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ اور گورنمنٹ کالج لدھیانہ کا گولڈ میڈل بھی ملا۔ بھائی ساحر حکومت مہاراشٹر کی طرف سے جسٹس آف پیس اور اسپیشل ایگزیکٹو مجسٹریٹ بھی رہے۔

علاوہ ازیں ہند۔ پاک جنگ کے دوران ہمارے فوجی جوانوں نے اپنی فوجی چوکیوں کے نام ساحر کے نام پر رکھے۔ ہماری فوج کا مارچنگ نغمہ بھی ساحر کا لکھا ہوا ہے۔

کرنال سٹی پارک میں نہرو جی کے مجسمے کے نیچے بھائی ساحر کی نہرو جی کی وفات پر لکھی گئی نظم کو وصیت کے طور پر کندہ کیا گیا۔ ان کے وطن لدھیانہ میں ایک سڑک اور جلسہ گاہ کا نام ساحر کے نام پر رکھا گیا۔ لدھیانہ کی زراعتی یونیورسٹی نے جب ایک نیا پھول تخلیق کیا تو اس کا نام گلِ ساحر رکھا۔ ممبئی شہر میں بھی ایک چوک کا نام پدم شری ساحر لدھیانوی چوک رکھا گیا ہے۔

کبھی کبھی مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے جب شمس الرحمن فاروقی جیسے نقاد بھائی ساحرؔ کو معمولی شاعر قرار دیتے ہیں یا ندا فاضلی جیسے جدید شاعر کہتے ہیں کہ جشنِ کرشن چندر میں جو نظم ساحرؔ صاحب نے پڑھی تھی وہ جان نثار اختر کی لکھی ہوئی تھی۔

خیر چھوڑیئے۔ بھائی ساحرؔ کا ذکر چل رہا ہے تو دو چار ایسی باتیں آپ کو بتا دوں جو آپ کے لئے انکشافات کا باعث ہوں گی۔

بھائی ساحرؔ کو ہم سے بچھڑے ۱۸ سال ہو گئے ہیں لیکن آج بھی مہینے میں ایک دو خط اُن کے نام ضرور آ جاتے ہیں۔ کبھی کسی ٹرسٹ کا۔ کبھی کسی مسجد کا۔ کبھی کسی نئے شاعر کا۔ جو لکھتا ہے کہ ساحر صاحب اپنے گیت بھیج رہا ہوں انہیں دُرست کر دیجئے یا کہیں لگوا دیجئے۔

اس ضمن میں بات دراصل کچھ یوں ہے کہ جب بھائی ساحرؔ کا انتقال ہُوا تو یہ شاعر بچے تھے اس لئے شاید انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ بھائی ساحر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ بھائی ساحرؔ کا ایک نوجوان پرستار سُدھیر ہے جو آج بھی امرتسر سے ہفتے میں دو بار فون کرتا ہے اور پنجاب کے کسی بھی اخبار میں اگر ساحرؔ صاحب کے بارے میں کچھ چھپتا ہے تو اس کی کٹنگ روانہ کرتا ہے۔

کیا ایسا کسی نقاد کے ساتھ اس کی موت کے بعد ہوگا، جو اچھی اور بُری شاعری کا فیصلہ کرتا ہے؟

بھائی ساحر کے بارے میں ایک اور بات آپ کو بتاؤں کہ وہ ریل اور ہوائی جہاز کے سفر کو ہمیشہ اَوائیڈ کرتے تھے۔ اکثر کہیں بھی جانا ہوتا تھا تو اپنی دونوں گاڑیاں لے کر جاتے تھے۔

اس دَوران میں الٰہ آباد میں رہتی تھی اور مجھے ایک دو بار اُن کے ساتھ دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار جب ہم اپنے سفر پر نکلے اور اِندور پہنچے تو ایک جگہ سڑک کے کنارے کار روک کر سب نے ایک ہوٹل میں چائے پی۔ لیکن جب بھائی ساحر بِل دینے لگے تو ہوٹل والے نے صاف انکار کر دیا اور ہنستے ہوئے بولا "بھئی ساحر صاحب ہم آپ سے بِل نہیں لیں گے، بس آپ ہمارے ساتھ ایک فوٹو کھنچوا لیجیے، سمجھیے ہمارا بِل ادا ہو گیا۔" اور پھر اس نے فوراً فوٹوگرافر کو بلوایا اور ساحر صاحب کے ساتھ فوٹو کھنچوالیے۔

بھائی ساحر شام سات بجے کے بعد کبھی سفر نہیں کرتے تھے۔ اکثر راستے میں جو بھی سرکاری یا غیر سرکاری گیسٹ ہاؤس مل جاتا وہ وہیں ٹھہر جاتے۔ انہیں ہر جگہ بڑے آرام سے جگہ مل جاتی تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھائی ساحر نے کبھی اپنا ذاتی سیونگ بینک اکاؤنٹ نہیں کھولا اور نہ ہی سُود کھایا۔ لیکن وہ عابد و زاہد بھی نہیں تھے۔ اپنے انداز کی زندگی جینا انہیں پسند تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سُناتی چلوں۔

پچھلے دِنوں مشہور ڈرامہ نگار ریوتی سرن شرما جب بھائی صابر دت کی عیادت کے لئے "پرچھائیاں" میں تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ بھائی ساحر سے اُن کی پہلی ملاقات پاکستان میں ہوئی تھی۔ ہُوا یوں تھا کہ شرما جی اپنے دوست افسانہ نگار انتظار حسین سے ملنے کے لئے "نظام ویکلی" لاہور کے دفتر گئے تو اتنے میں ساحر باہر سے آ گئے۔ انہوں نے انتظار حسین کے کان میں کچھ کہا اور باتھ روم چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوٹے اور کہنے لگے۔

"بھائی ریوتی، اب اس ملک میں ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے ہندو تو چلا گیا ہے۔ رمضان کے دن ہیں۔ بڑی مشکل میں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سگریٹ کہاں جا کے پیوں۔ باتھ روم میں پی کے آیا ہوں"۔ اور اس کے کچھ دن بعد ساحر ممبئی آ گئے۔

اِس کتاب میں، میں نے بھائی ساحر لدھیانوی پر مشہور افسانہ نگار اے۔ حمید کا لکھا ہوا ایک خوبصورت خاکہ بھی شامل کیا ہے۔ یہ خاکہ آپ پر بھائی ساحر کی زندگی کے کئی پہلو اُجاگر کرے گا اور آپ کو بتائے گا کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھائی ساحر پہ لاہور میں کیا گذری اور وہ لاہور چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ممبئی کیوں چلے آئے۔

اپنی بات پُوری کرنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ میں اِن دنوں "بچے مَن کے سچے" کے عنوان سے بھائی ساحر کی لکھی شاعری پر بھی ایک کتاب مرتب

کر رہی ہوں جو انہوں نے بچّوں کے لئے کی تھی ۔ اس میں بھائی ساحر کا
وہ کلام شامل ہے جو ’گاتا جائے بنجارہ‘ میں شامل نہیں ہے۔ ساتھ ہی
چند ایسے فلمی گیت بھی ہیں جو منظر عام پر نہ آسکے کیونکہ وہ فلمیں ادھوری
رہ گئیں جن کے لئے وہ لکھے گئے تھے۔

”بچّے مَن کے سچّے“ کے علاوہ ساحر پبلشنگ ہاؤس ایک اور کتاب
” ساحر لدھیانوی ۔ شاعرِ شیوا بیاں“ بھی شائع کر رہا ہے، جسے پروفیسر
گوپی چند نارنگ اور صابر دت نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی سب
سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جن نقّاد حضرات نے ترقی پسندی کو رَد کیا وہی حضرات
ساحر کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر کارلو کیولا ،
ڈاکٹر وزیر آغا ، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر نظیر صدیقی، پروفیسر عتیق احمد،
ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر تارا
چرن رستوگی، ڈاکٹر منظر اعظمی اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بہت باتیں ہو چکیں، اب آپ بھائی ساحر کی غیر مطبوعہ شاعری
کا لُطف اٹھائیے اور ہمیں اجازت دیجیے۔

سرور شفیع

ساحر لدھیانوی

اے حمید

ساحر لدھیانوی نے کمرے کی اونچی چھت اور پرانی کھڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔

"یہ تو مجھے کوئی بھوت گھر لگتا ہے۔"

ابن انشاء نے اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے آنکھیں گھما کر کہا۔

"اب بھی اس میں بھوت ہی رہیں گے۔"

ابن انشاء اور ساحر لدھیانوی کے یہ ریمارکس اُس عمارت کے بارے میں تھے جو ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے بالکل سامنے واقع ہے۔ ان دنوں یہ ایک ویران اجڑی ہوئی سرخ عمارت تھی جس کا ذکر ہمیں آج بھی آرتھر کانن ڈائیل اور ایڈگر ایلن پو کی پراسرار کہانیوں میں ملتا ہے۔ پاکستان کو بنے بمشکل چھ سات مہینے ہوئے ہوں گے۔ جن علاقوں کو ہندو سکھ چھوڑ کر گئے تھے وہ بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ کرشن نگر، ماڈل ٹاؤن، نسبت روڈ، نکلسن روڈ اور پرانا قلعہ گوجر سنگھ۔ ان آبادیوں کے سبھی مکان خالی تھے۔ اگرچہ کافی لوٹ مار ہو چکی تھی لیکن اب بھی کئی مکانوں میں سامان پڑا تھا۔ قلعہ گوجر سنگھ میں عبدالکریم مدرڑ کی ایک گلی کے دو منزلہ شاندار مکان کو توڑ کر لوگ اندر

داخل ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ دوسری منزل کی گیلری میں لوہے کے بڑے بڑے صندوق پڑے تھے جو قیمتی ریشمی پارچہ جات اور خدا جانے کس کس طرح کی چیزوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں توڑ کر لوٹ لیا گیا۔

ہمیں فیض باغ میں جو ایک تنگ و تاریک مکان الاٹ ہوا تھا۔ وہاں گرمی اور حبس بڑا تھا۔ چنانچہ اس مکان سے میں نے ایک پورٹیبل جاپانی ٹیبل فین اٹھایا اور اسے گھر لے آیا۔ عبدالکریم روڈ پر یہ ہو رہا تھا کہ لوگ کوئی مکان پسند کر کے وہاں اپنا آدمی بٹھاتے اور پھر ارد گرد کے مکانوں سے اپنی پسند کی چیزیں اٹھا اٹھا کر اس گھر میں رکھنی شروع کر دیتے۔ مثلاً قالین، کرسیاں، تپائیاں، چارپائیاں، پلنگ، اچار اور مربّوں کے بیام، چینی اور چاول کی بوریاں، برتن اور دوسرا سامان۔

ہندو سکھ لاہور سے بھرے گھر چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ان کے باورچی خانے آٹا، چاول، دال اور اچار مربّوں سے لدے ہوئے تھے۔ میں خود ایک مکان سے آم کے مربے کا بیام اٹھا کر لے گیا تھا۔ ویسا آم کا مُربّہ پھر کہیں نہیں کھایا۔ ایک الماری میں کسی ہندو یا سکھ لڑکی کی چھوٹی سی ٹوکری پڑی تھی جس میں کروشئے کا سامان تھا۔ دھاگوں کے نیچے مجھے پانچ روپے کا نوٹ ملا۔ ایک ننھی سی کلائی کی گھڑی بھی تھی جو میرا پولیس کانسٹبل ساتھی لے گیا۔

گوال منڈی میں ہندو سکھوں کے مکان بھی خالی پڑے تھے۔ تھانہ گوال منڈی کے سامنے والے مکان کی ایک ادھیڑ عمر کی ہندو عورت نے اپنا مکان نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھی آتے جاتے لوگوں کو مخاطب کر کے کہتی۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ لوگ چلے گئے ہیں تو جاتے رہیں۔"

اس کے باقی گھر والے ہندوستان جا چکے تھے۔ خدا جانے اس عورت کا بعد میں کیا حشر ہوا۔ اسی طرح ایک ادھیڑ عمر کے ہندو میاں بیوی کو میں نے سوتر منڈی لاہور میں بھی دیکھا۔ چوک سوتر منڈی سے جو گلی بازار شیشہ موتی کو مڑتی ہے اس کی نکڑ پر اس ادھیڑ عمر ہندو کی دکان تھی۔ وہ سر پر گول ہندوانہ ٹوپی رکھے صندوقچی کے آگے بیٹھا مسلمان مریضوں کو دوائی دیتا۔ اس کی بیوی دکان کے اندر صف پر بیٹھی ہوتی۔ یہ ہندو جوڑا بعد میں دکھائی نہ دیا۔

رائل پارک کی بلڈنگیں بھی سنسان تھیں۔ صرف لکشمی بلڈنگ کے نچلے حصے میں کچھ مہاجر آباد ہوئے تھے۔ رائل پارک کی گلیاں کچی تھیں اور چوک میں ایک طرف لکڑی کے شہتیروں کا ڈھیر لگا تھا۔ کبھی کبھی میں اور احمد راہی ان شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔

پھر احمد راہی عارف عبدالمتین کے ساتھ فکر تونسوی کو نکالنے تونسہ تشریف لے گئے۔ اس دوران میں ساحر لدھیانوی اور میں نے رائل پارک کی ایک بلڈنگ کی پہلی منزل پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں اس منزل میں قتیل شفائی

آ گیا تھا۔ اُن دنوں قتیلؔ شفائی کا ایک ہندو عورت چندر کانتا کے ساتھ سکینڈل بڑے زوروں پر تھا۔ وہ ہندوستان نہیں گئی تھی اور اسی منزل میں مقیم تھی۔ سعادت حسن منٹو نے اس عورت پر اپنا افسانہ "موچنا" لکھا کیونکہ مشہور تھا کہ اس عورت کے سینے پر بال ہیں جنہیں وہ موچنے سے اکھیڑتی رہتی ہے۔

فکرؔ تونسوی آ گیا۔ دُبلا پتلا، باریک آنکھوں والا ذہین نوجوان جسے تونسہ شریف سے چلے آنے کا افسوس تھا۔ "ادبِ لطیف" کی ایڈیٹری کا زمانہ اس نے ہمارے ساتھ اسی منزل میں گذارا۔ بس ایک ڈرائنگ روم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ سامان وہاں سوائے ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے کوئی نہ تھا۔ کارنس پر ایک کانسی کا بڑا سا پیالہ پڑا رہ گیا تھا۔ اس پیالے میں ہم باری باری پانی پیا کرتے تھے۔ ابنِ انشاء ایک روز وہاں آیا تو اس پیالے کو دیکھ کر کہنے لگا۔

" ارے یہ تو وہی پیالہ ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا۔"

رات کو فکرؔ تونسوی صوفے پر، عارف عبدالمتین اور ساحر لدھیانوی زمین پر اور میں اور احمد راہی پلنگ پر سو رہتے۔ ہماری جیبیں اکثر خالی رہتی تھیں۔ کبھی دو چار روپے ہوتے اور کبھی کچھ بھی نہ ہوتا۔ غزل کا معاوضہ پانچ دس روپے اور کہانی افسانے کا معاوضہ مجھے پندرہ اور پچیس روپے کے درمیان ملتا تھا۔ اس سے کچھ روز گزر بسر ہوتی اور پھر وہی فاقہ مستی

شروع ہو جاتی۔

ہمارے پبلشر زدہ تھے جنہوں نے اس ملک میں اعلیٰ ترین معیاری طباعت اور کلاسیکل ادبی روایات کی بنیاد رکھی۔ لیکن پیسے دینے کے معاملے میں بہترین ٹال مٹول کرنے والے تھے۔ احمد راہی اور فکر تونسوی ادبِ لطیف کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں راہی "سویرا" کا ایڈیٹر بن گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی کی "تلخیاں" شائع ہو چکی تھی اور بیحد مقبول ہوئی تھی مگر پبلشر سے پیسے اسے توڑ توڑ کر ملتے تھے۔ ایک روز میں اور ساحر لدھیانوی "سویرا" کے دفتر گئے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ پبلشر سے قسط کے پیسے لے کر انار کلی کے ہوٹل ممتاز میں چائے پیسٹری اڑائیں گے۔

اُن دنوں ہماری سب سے بڑی عیاشی یہی ہوا کرتی تھی یا زیادہ سے زیادہ کوئی فلم دیکھ لی اور کپڑے بنوا لیئے۔ اسی پبلشر نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منزل منزل" بھی شائع کیا تھا اور کچھ پیسے میرے بھی لگتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کچھ پیسے وصول کر لوں گا۔ "سویرا" کا دفتر ان دنوں بھی لوہاری کے باہر ہی تھا یعنی جہاں آج کل ہے۔

چوہدری نذیر بڑے باغ و بہار اور علم دوست پبلشر تھے اور ہم سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ میں اور ساحر "سویرا" کے دفتر میں آئے تو چوہدری صاحب میز پر جھکے پوسٹ کارڈ لکھ رہے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ زیر مونچھ ذرا مسکرائے اور

کارڈ لکھنے میں محو ہو گئے۔ چہرے پر خاص مسکراہٹ ابھی تک ویسی ہی تھی۔
جن مصنفین کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے وہ خوب جانتے ہوں گے کہ پبلشر سے پیسے طلب کرنا کس قدر مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ چوہدری نذیر سے ہماری بڑی دوستی تھی لیکن کتاب کے پیسے مانگتے وقت ہم پتھر ہو جاتے تھے۔ ایک بار ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ پبلشر سے پیسے وصول کرنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ جاتے ہی حرف مطلب بیان کر دو۔ وگرنہ جوں جوں دیر ہوتی جائے گی تمہارے اندر کی جرأت ختم ہو جائے گی اور تمہارا کیس کمزور ہو جائے گا۔
ساحر ڈرپوک تھا۔ اس میں جرأت رندانہ کا فقدان تھا۔ اب ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔
میں نے ساحر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔
"چلو مانگو اپنی کتاب "تلخیاں" کے باقی پیسے؟"
اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جواب دیا۔
"تم کیوں نہیں مانگتے اپنے افسانے کے بقایا پیسے؟"
میرے پیسے زیادہ نہیں تھے کیونکہ چوہدری نذیر صاحب نے میرے پیسے کبھی نہیں رکھے تھے اور ہمیشہ مجھے میرا معاوضہ دو تین قسطوں میں ادا کر دیا کرتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ میرے کچھ پیسے ان کی طرف رہ جائیں۔
اتنا مجھے یقین تھا کہ ساحر لدھیانوی پیسوں کا تقاضا نہیں کرے گا۔

اور پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر مجھے ہی نکالنی پڑے گی۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں چوہدری صاحب کے قریب جاکر جھٹ کہہ دیا۔ "چوہدری صاحب! پیسوں کی سخت ضرورت آن پڑی ہے۔"

"خیر تو ہے۔ کیا ضرورت پڑ گئی تم لوگوں کو؟"

کچھ بہانہ ساحر لدھیانوی نے بنایا۔ کچھ میں نے بنایا جس پر چوہدری صاحب نے قلم میز پر رکھ کر دونوں ہتھیلیوں کی انگلیوں کو باری باری پوری طرح چٹخایا اور پھر بولے۔

"برخوردارو! حالات اور فسادات نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پیسہ تو دیکھنے کو نہیں مل رہا۔ تمہارے سامنے ایجنٹوں کو کارڈ لکھ رہا ہوں۔ ہاں ابھی ڈاک میں کوئی منی آرڈر آ گیا تو سارے کے سارے پیسے لے لینا۔"

ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ پبلشروں کی دکان پر منی آرڈر لانے والے ڈاکیے جب دیکھتے ہیں کہ وہاں شاعر ادیب بیٹھے ہیں تو آتے ہی اعلان کر دیتے ہیں۔

"آج تو کوئی منی آرڈر نہیں ہے جناب۔"

یہ ان کو پبلشروں کی طرف سے خاص ہدایت تھی۔ اب ساحر کو بھی ہوش آ چکا تھا۔ اس نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب! آج تو ہمیں کچھ پیسے دے ہی دیں۔ بڑی سخت ضرورت ہے۔"

"آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ کیا ضرورت ہے؟"

"بس ہے ضرورت۔ آپ کہیں سے کچھ پیسوں کا بندوبست کر دیں۔"
اس پر چوہدری صاحب اٹھے۔ پچھلے دروازے سے باہر گئے اور پندرہ بیس روپے کسی سے ادھار مانگ کر ہمارے لئے لے آئے۔
"یہ بیس روپے ہیں، پریس والوں سے ادھار مانگ کر لایا ہوں۔ اس میں سے پانچ مجھے دیدو باقی تم دونوں رکھ لو۔"
ساحرلدھیانوی نے کہا
یہ پانچ روپے آپ ڈاک خرچ کے لئے رکھ رہے ہیں چوہدری صاحب"۔
چوہدری صاحب نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر کہا۔
"میرے عزیز دوستو! اب تم کس ہوٹل میں جاؤ گے؟"
ہمارے اکثر پبلشروں کو ہماری اس کمزوری کا علم تھا کہ ہم پیسے ملتے ہی کسی نہ کسی ہوٹل کا رخ کرتے ہیں اور وہاں کھانا کھاتے ہیں، اور چائے پیسٹری اور عمدہ سگرٹوں کی عیاشی کرتے ہیں۔
میں نے کہا۔
"کیوں بھئی ساحرلدھیانوی کیا ارادے ہیں؟"
میرا خیال تھا کہ ساحرلدھیانوی کچھ اور بہانہ بنالے گا مگر اسے جھوٹ بولنا کم آتا تھا۔ اس نے صاف ہی کہہ دیا۔
"ممتاز ہوٹل میں چائے پینے جارہے ہیں، آپ بھی چلیں ہمارے

ساتھ۔" چوہدری صاحب نے مصروفیت کی بنا پر اس دعوت کو قبول نہ کیا۔ لیکن اخلاقی طور پر ہمارا دل رکھنے کی غرض سے اپنی دکان کا ایک لڑکا ہمارے ساتھ کر دیا۔ ممتاز ہوٹل میں ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ لتا منگیشکر، ہیمنت کمار، جگموہن، طلعت محمود، رفیع اور گیتا رائے کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ ہم دیوار کے ساتھ لگی ایک میز کے پاس کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہ لڑکا بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ بڑا خاموش طبع لڑکا تھا۔ خاموش فلموں کے زمانے کا لگتا تھا۔ ہم نے چائے اور پیسٹریوں کا آرڈر کیا۔ اس خاموشی پسند لڑکے نے پیسٹریوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیسٹریاں کھا رہا تھا۔ کریم رول اس نفاست سے کھاتا کہ کیا مجال جو کریم کا ایک قطرہ بھی نیچے گر جائے۔

ساحر لدھیانوی کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی اس لڑکے کا منہ تکتا جو کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ پیسٹریاں کھانے کا نیا ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔ جب ہم پورے کے پورے پیسے بل کی شکل میں ادا کرنے کے بعد ممتاز ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے تو اس لڑکے کا یہ عالم تھا کہ ایک پیسٹری ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

ساحر لدھیانوی لمبے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لمبا قد ہونے کی وجہ سے وہ ذرا آگے کو جھک کر چلتا۔ لہجہ خالص لدھیانوی تھا۔ اردو لدھیانوی پنجابی انداز میں بولتا۔ بات نرمی سے کرتا اور کھل کر کبھی قہقہہ

نہیں لگاتا تھا۔ شعر سنتے وقت ذرا ذرا مسکراتا رہتا تھا۔ اُن دنوں ساحر کی نظم "ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں" اور "تاج محل" کا بڑا چرچا تھا۔ "تاج محل" تو کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بے حد پاپولر تھی۔ مشاعرے میں یہ دونوں نظمیں خاص طور پر لوگ فرمائش کر کے اس سے سنتے۔

ساحر مشاعرے میں اپنی نظم پڑھتے ہوئے جھینپ جایا کرتا تھا۔ جب اس کے کسی شعر پر لوگ داد دیتے تو اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا۔ کھانے پینے میں بڑا سادگی پسند تھا۔ کپڑے زیادہ تر کھدر کے پہنتا۔ اس کا ایک گرم اوور کوٹ تھا، جسے میں احمد راہی اور عارف عبدالمتین بھی پہنا کرتے تھے۔ ابن انشا اس کوٹ کو گوگول کا اوور کوٹ کہا کرتا۔

رائل پارک والی بلڈنگ کے دن بڑے یادگار دن تھے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی ایک دل کشی اور جشن کا پہلو تھا۔ ہمیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی کہ دن کا ناشتہ کر لیا ہے تو دوپہر کا کھانا کہاں سے کھائیں گے؟ ناشتہ یہ ہوتا کہ چائے کے ساتھ دو سلائیس کھا لیتے۔ رات کو جب سگریٹ ختم ہو جاتے تو آپس میں پیسے ڈال کر بازار سے سگریٹ لاتے۔ بڑے ستاروں والے کیپسٹن کا پیکٹ اُن دنوں شاید تین چار آنے میں آتا تھا۔ یہ سگریٹ ہم سبھی بڑے

شوق سے پیا کرتے تھے۔ عارف سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ وہ ہمیں سگریٹ پیتے دیکھا کرتا تھا۔ عارف امرتسر سے ہی نظمیں کہتا لاہور آیا تھا۔ اور یہاں آکر بڑی اچھی شاعری کر رہا تھا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ سگریٹ حسب معمول ختم ہو گئے۔ فکر تونسوی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو آنے نکال کر کہا۔

"دوستو! میں یہ نذرانہ پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے سوا اس خاکسار کی جیب میں خاک نہیں۔"

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

"چلو اے حمید اس کے سگریٹ لے آؤ تم۔"

میں نے احمد راہی کو ساتھ لیا تو ساحر نے آواز لگا دی۔

"کمینو! آدھے سگریٹ راستے میں ہی نہ پی آنا۔ یہاں آکر ہمارے ساتھ پینا۔"

رات کافی گزر چکی تھی۔ ستمبر کی خوشگوار رات تھی اور معمولی سی خنکی تھی۔ میکلورڈ روڈ ان دنوں دن کے وقت ویران سی ہوتی تھی رات کو بالکل ہی سنسان تھی۔ گنپتا بھون بلڈنگ کے نیچے ایک مراد آبادی بزرگ پان سگریٹ کا کھوکھا لگاتے تھے۔ وہ اپنے کھوکھے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کیپسٹن کے سگرٹوں کی نصف ڈبی لی اور رائل پارک میں آگئے۔

چوک میں آ کر ہم نہ جانے کیوں شہتیروں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں ایسے مگن ہوئے کہ یہ خیال ہی نہ رہا کہ ساحر لدھیانوی اور فکر تونسوی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہم دو سگریٹ پی گئے۔ پھر خیال آیا کہ وہ لوگ تو سگریٹوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جلدی سے اُٹھ کر وہاں پہنچے تو ہمارا خیر مقدم بڑی لچھے دار گالیوں سے ہوا۔ ساحر لدھیانوی کا نشہ ٹوٹنے سے بُرا حال تھا۔ فکر تونسوی کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

"کمینو! کہاں ہیں سگریٹ؟"

ہم نے جھٹ باقی تین سگریٹ ان کی طرف پھینک کر کہا۔

"ہم اپنے حصے کے سگریٹ پی آئے ہیں"۔

ساحر لدھیانوی نے مسکرا کر کہا۔

"اب اِن سگریٹوں کا دھواں بھی تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ فکر قابو کر کے رکھ لے ڈبی کو"۔

فکر تونسوی نے ڈبی کھول کر ایک سگریٹ خود لگایا' ایک ساحر لدھیانوی کو لگا کر دیا۔

عارف بولا۔

"دوستو! کیا تم ایک سگریٹ سے کام نہیں چلا سکتے۔ ختم ہو گئے تو پھر کیا کرو گے؟ ابھی تو ساری رات پڑی ہے"۔

ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

" اب تو ہم بھی پورا پورا سگریٹ پیئں گے۔ یہ اے حمید اور احمد راہی کیوں ایک ایک سگریٹ ختم کر کے آئے ہیں۔"

ہمارے لئے بڑی مصیبت تھی کیونکہ ہمیں تو وہ سگریٹ کا ایک کش لگانے کی بھی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہمارے سامنے انہوں نے ایک ایک سگریٹ ختم کیا اور اس کا دھواں بھی دوسری طرف پھینکتے رہے۔ ایک سگریٹ باقی رہ گیا تھا۔ عارف کو نیند آ گئی۔ وہ تو فرش پر بچھی ہوئی دری پر سو گیا۔ ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھی نیند سے لال ہو رہی تھیں۔ رات کے دو بج چکے تھے۔

اُس نے جمائی لے کر کہا۔

" یار! میں تو سونے لگا۔"

فکر نے کہا۔

" آج صوفے پر میں سوؤں گا۔"

ساحر جھٹ بولا۔

" اور میں تمہارے سر پر سوؤں گا؟ میں زمین پر نہیں سو سکتا۔ میری کمر میں پہلے ہی درد رہتا ہے۔"

احمد راہی نے کہا۔

" اوئے ساحر! پھر تو تمہیں ضرور زمین پر سونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ حکیمی نسخہ ہے کہ جس کی کمر میں درد ہو اس کے لئے فرش پر سونا فائدہ مند

ہوتا ہے۔"

ساحر لدھیانوی بولا۔

"آج تم کیوں نہیں سو جاتے زمین پر"

میری کمر میں درد نہیں ہے۔"

فکر تونسوی کہنے لگا۔

"یار کیا فضول بحث کر رہے ہو۔ میں تم لوگوں کو اپنا تازہ مزاحیہ مضمون سناتا ہوں۔ خدا کی قسم تم لوگوں کی نیند نہ اڑ جائے تو فکر نام نہیں۔"

ساحر لدھیانوی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"اے دشت نجد کے آوارہ مجنوں! خبردار جو تم نے مضمون سنانے کا پھر نام لیا۔"

فکر تونسوی ہنس کر بولا۔

"تو پھر چپکے سے زمین پر سو جاؤ اور میرے لئے آرام دہ صوفہ چھوڑ دو۔"

ساحر لدھیانوی نے سر جھکا کر کہا۔

"میں زمین کے اندر سو سکتا ہوں مگر تمہارا مضمون نہیں سن سکتا۔"

احمد راہی کہنے لگا۔

"ہم بھی تو تمہاری نظمیں سنتے ہیں، کبھی تم سے شکایت کی؟"

عارف عبدالمتین نے لیٹے لیٹے کہا۔

"دوستو! میری نیند تو غارت نہ کرو۔"
فکر تونسوی نے سر جھاڑ کر کہا۔
"چلو یار اب سو جاؤ۔ اے حمید سہگل کا کوئی گیت سناؤ یار۔ نیند ذرا جلدی آ جائے گی۔"
میں نے پلنگ کی پٹی پر ٹیک لگاتے ہوئے فلم "سٹریٹ سنگر" میں سہگل کا گایا ہوا ایک گیت سنانا شروع کر دیا۔
ع بابل مورا پتر چھوٹو جائے
ساحر لدھیانوی دری پر لیٹا دیوار کی طرف منہ کر کے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔
نیند بھری آواز میں بولا۔
"اے حمید تمہاری آواز میں بڑا سوز ہے۔"
فکر تونسوی بولا۔
"تم ریڈیو پر کیوں نہیں گاتے؟"
عارف سوتے سوتے بڑبڑایا۔
"خدا کے لئے سونے دو۔"
احمد راہی نے کہا۔
"میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا۔"
سب سو گئے۔ صرف میں اور احمد راہی جاگ رہے تھے۔ ہم دونوں

ایک ہی پلنگ پر چت لیٹے چھت کی ہُک کو تک رہے تھے جس کا پنکھا لوگ اتار کر لے گئے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ساحر لدھیانوی کی نیند بھری آواز آئی۔

"اوئے آہستہ باتیں کرو۔"

میں نے کہا۔

"اس سے آہستہ بات تو عارف متین ہی کر سکتا ہے ہم نہیں کر سکتے۔"

ساحر لدھیانوی ہنس پڑا۔ عارف عبدالمتین سو چکا تھا۔ نہیں تو وہ ضرور ہم پر کوئی نہ کوئی جملہ چست کرتا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی نیند آگئی۔ رات کے چار بجے تھے کہ میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میں نے فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو محسوس کی۔ ایک دو بار لمبے لمبے سانس لئے۔ کمرے کی بند فضا میں کیپسٹن کے سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ چھپ چھپ کر سگریٹ کون پی رہا ہے؟ جبکہ رات کو ہمارے سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔ بلکہ ہم نے تو فرش کے کونوں کھدروں سے ٹوٹے بھی ڈھونڈ کر پی لئے تھے۔

میں نے احمد راہی کو آہستہ سے ہلا کر جگایا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔"

اس نے اپنی لال لال آنکھیں کھول کر ناک کے چوڑے نتھنے پھیلائے

اور سرگوشی میں جواب دیا۔
ساحر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"
پھر وہ اُچھل کر پلنگ سے اٹھا اور ہم دونوں نے فرش پر لیٹے ساحر لدھیانوی پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بڑبڑا کر بولا۔
"کیا طوفان آ گیا ہے؟"
"سگریٹ کہاں ہے؟" احمد راہی نے مطالبہ کیا۔
ساحر لدھیانوی مٹھی میں سگریٹ کے ٹکڑے کو دبائے ہوئے تھا۔
"کمینے ہم سے سگریٹ کو چھپا کر پیتے ہو۔"
"فکر تونسوی بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
"یار یہ سگریٹ کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ ہمیں بھی ایک کش لگواؤ۔"
"ساحر پی رہا ہے۔"
"لاؤ یار ساحر! ایک جرعہ ہمیں بھی عنایت ہو۔"
"مگر یہ ہم سے چھپا کر سگریٹ پیتا ہے۔"
ساحر بولا۔
"آخری ٹکڑا کونے سے ڈھونڈ کر پی رہا تھا۔ یہ لو کمینو! تم بھی پیو۔"
اور ساحر لدھیانوی نے ٹکڑے کا آخری حصہ میری جھولی میں پھینک دیا۔ میں نے جھولی کو جھٹکا تو جلتا ہوا سگریٹ عارف کی گردن پر جا

گرا۔ وہ اُچھل کر اُٹھ بیٹھا۔

"کیا مصیبت ہے؟"

سگریٹ کا ٹکڑا عارف کی گردن سے اچھل کر فکر تونسوی کے صوفے کی طرف آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کیچ کر کے اسے ہتھیلیوں میں دو ایک بار اچھالا اور پھر اسے انگلیوں میں دبا کر کش پر کش لگانے شروع کر دیئے۔

"سگریٹ کے آخری حصے میں بڑی نکوٹین ہوتی ہے۔ بڑا نشہ آ رہا ہے۔"

فکر تونسوی، عارف اور احمد راہی تو پھر سو گئے لیکن میں اور ساحر لدھیانوی جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ صبح ہونے والی تھی۔ اس وقت ہمیں چائے اور سگریٹ کی بڑی طلب ہوئی۔ ساحر لدھیانوی نے کہا۔

"اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "وعدہ کرتا ہوں، وہ حسین راز کیا ہے؟"

ساحر لدھیانوی سرگوشی میں بولا۔

"میری جیب میں اس وقت پورے دو روپے پڑے ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ میں نے اپنے سوئے ہوئے دوستوں

کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اگر تم بھی وعدہ کرو کہ کسی سے بات نہیں کرو گے تو میں بھی تمہیں ایک حسین راز بتا سکتا ہوں"۔
ساحر لدھیانوی نے جھٹ سوال کیا۔
"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"
"ڈیڑھ روپیہ میری جیب میں ہے"۔
ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔
"چلو پھر باہر چل کر کہیں چائے پیتے ہیں"۔
"چلو"۔
ہم دونوں آہستہ سے دبے پاؤں اٹھ کر دروازے کے پاس ہی آئے تھے کہ احمد راہی کی بھاری بھرکم خواب آلود آواز گونجی۔
"تم دونوں کمینے ہو"۔
اس سے پہلے کہ احمد راہی ہمیں گالیاں دیتا' ہم بھاگ کر گلی میں آ چکے تھے اور ہنس ہنس کر ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا۔
ساحر لدھیانوی بولا۔
ایک پیکٹ سگریٹ ان کو بھی دے کر جائیں گے"۔
"ٹھیک ہے"۔
ہم میکلوڈ روڈ پر آ گئے۔ ستمبر کے آسمان پر خنکی تھی اور رات

ڈھل رہی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ برسٹل ہوٹل کے باہر ایک تانگہ کھڑا تھا جس کا کوچوان اگلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ مراد آبادی کھوکھا بند تھا۔ ساحر لدھیانوی کہنے لگا۔

"پیارے! اِس وقت تو صرف ا ریلوے اسٹیشن پر ہی چائے مل سکتی ہے۔ واپسی پر ان لوگوں کے سگریٹ بھی وہیں سے لیتے آئیں گے"

"چلو اسٹیشن پر ہی چلتے ہیں۔"

اور ہم دونوں ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ رتن سنیما ویران پڑا تھا۔ "چٹان" کا دفتر بند پڑا تھا اور باہر چوکیدار فرش پر ہی سو رہا تھا۔ "لاہور ہوٹل" کی عمارت ابھی تک پرانی ہی تھی اور اس کے ساتھ والی مشہور پارسی لانڈری اور کشمیری لانڈری کی دکانیں بھی بند تھیں۔ ریلوے سٹیشن جاگ رہا تھا۔ لوہے کی اونچی چھت والے تانگہ اسٹینڈ میں تانگے کھڑے تھے۔ سامنے جو چھوٹا سا پلاٹ ہوا کرتا تھا وہاں مہاجر کیمپ بنا تھا جہاں ہندوستان سے آنے والے مہاجرین گھڑی پل کو رُکتے تھے اور پھر انہیں مسلم لیگ کے ٹرکوں میں ڈال کر والٹن کیمپ پہنچا دیا جاتا تھا۔

ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔ پلیٹ فارم پر ٹکٹ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اُن دنوں ریلوے ٹکٹ بھی کوئی نہیں خریدتا تھا۔ مہاجرین کی سپیشل ٹرینیں چلا کرتی تھیں۔ مسافر مفت سفر کرتے تھے۔ پلیٹ

فارم پر جگہ جگہ پناہ گزین عورت مرد اور بچے کس مپرسی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم نمبر ۴ پر لاہور کے مختلف علاقوں سے نکلے ہوئے ہندو اور سکھ بھی ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھے امرتسر جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان مہاجران ہندو سکھوں کو عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔

"ان ہندو سکھوں کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"تو پھر کہاں جاتے یہ لوگ؟" میں نے کہا۔

ساحر بولا۔

"انہیں ڈی اے وی کیمپ ہی میں رُکے رہنا چاہئے تھا۔ کسی قافلے کے ساتھ وہیں سے روانہ ہوتے تو اچھا تھا۔"

اُن دنوں ڈی اے وی کالج کو ہندو سکھ مہاجرین کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ خدا جانے یہ ہندو سکھ کیوں اور کس طرح ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۴ پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ہم ریلوے کینٹین کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر چائے پینے لگے۔ وہیں سے ہم نے سگریٹ بھی لے لئے تھے۔ ریلوے سٹیشن کی چائے بڑی اچھی ہوتی تھی اور بھاری پیالی دو اونس کی ہوا کرتی تھی۔ پیالی کے باہر لکھا ہوتا تھا۔

"دو اونس"۔

اتنے میں شور مچا کہ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر فیروز پور سے مسلمانوں کی ایک کٹی ہوئی ریل گاڑی آئی ہے۔ میں اور ساحر لدھیانوی پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آ گئے۔ تھرڈ کلاس کے لال ڈبوں والی ایک ریل ابھی ابھی پلیٹ فارم پر آ کر لگی تھی اور مسلم لیگ کے رضاکار اور پولیس کے سپاہی ڈبوں میں سے شدید زخمی اور شہید مسلمان عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کی لاشیں نکال رہے تھے۔ ڈبوں میں خون ہی خون تھا۔ کٹے ہوئے انسانی اعضا جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ زخمی کراہ رہے تھے اور انکی آنکھیں دہشت سے پھٹی پھٹی تھیں۔ لاشوں کے جسم تلواروں، نیزوں اور کرپانوں کی ضربوں سے چھلنی تھے۔ ساحر لدھیانوی نے میرے کان میں کہا۔

"اب ان ہندو سکھوں کی خیر نہیں جو پلیٹ فارم نمبر ۴ پر بیٹھے ہیں۔ چلو یہاں سے نکل چلیں۔"

میں نے سپنسرز کی خوشبودار چائے کا آخری گھونٹ یاد کیا اور سگریٹ سلگا کر ساحر کے ساتھ پل کی سیڑھیاں اتر کر سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب دن کا اجالا چاروں کی طرف پھیل چکا تھا۔ ریلوے پوسٹ آفس کی جانب سے پناہ گیر مہاجر پریشاں حال باہر نکل رہے تھے۔ ہم پلاٹ والے مسلم لیگ کے چھوٹے سے کیمپ میں آ کر رک گئے۔ ایک بند شیشوں والی سٹیشن ویگن میکلوڈ روڈ کی جانب سے آئی اور سٹیشن کے پورچ کے سامنے رکنے ہی لگی تھی کہ اس

پر حملہ ہو گیا۔

معلوم ہوا کہ یہ سٹیشن ویگن ہندو عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی ہے۔ حملہ آور لاٹھیوں اور خنجروں سے مسلح اس کی طرف بڑھے۔ ویگن کی رفتار ہلکی تھی۔ انہوں نے حملہ کر دیا اور ویگن کے شیشوں پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ ڈرائیور نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا اور ویگن کو ٹھہرتے ٹھہرتے پھر سے پہلے گیئر میں ڈال کر جو اٹھایا تو بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے کیمپ کے آگے سے بھگا کر نکال کر لے گیا۔ جو ہندو خاندان ویگن میں سوار تھا بڑا خوش قسمت تھا کہ بچ کر نکل گیا۔

ریلوے پوسٹ آفس کی طرف سے کچھ سپاہی اور دوسرے نوجوان پاکستان کا جھنڈا لہراتے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے ریلوے کے برآمدے کی طرف بڑھے۔ ٹھیک اسی وقت ایک بد قسمت سکھ نوجوان کو موت گھیر کر وہاں لے آئی۔ خدا جانے اُس سکھ نوجوان کی عقل ماری گئی تھی کہ ہاتھ میں چھوٹا سا چمڑے کا اٹیچی کیس لئے شہید گنج کی جانب سے آیا اور سٹیشن کے پورچ کی طرف بڑھا۔ نسواری رنگ کے سوٹ میں ملبوس نسواری پگڑی باندھے وہ ایک جوان اور خوش شکل سکھ تھا۔ لڑکوں نے اسے وہیں پکڑ لیا۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر سکھ ہمارے کیمپ کی طرف بھاگا۔ ایک لڑکے نے ڈبل اینٹ اٹھا کر زور سے اس کے ماتھے پر ماری۔ سکھ کی پگڑی کھل کر سڑک پر گر پڑی۔

اس کے بال بکھر گئے۔ ماتھے سے خون کا فوارہ بہہ نکلا اور وہ چکراتا ہوا ہماری طرف آیا۔ پیچھے سے ایک بھرپور وار لاٹھی کا پڑا۔ سکھ نوجوان کے ہاتھ سے اٹیچی کیس گر کر کھل گیا اور وہ سڑک پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی ایک نوجوان خنجر لہراتا اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور اس کے سینے اور پیٹ پر خنجر کے وار کرنے شروع کر دئیے۔

سکھ نوجوان نے موت کو قبول کر لیا تھا۔ وہ ہم سے کوئی دس بارہ قدم پر سڑک پر چت پڑا تھا اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ خون میں نہا گیا تھا۔ اس کا سینہ اور پیٹ جگہ جگہ سے پھاڑ کر لڑکا اٹھ کر ایک طرف بھاگ گیا تھا۔ سکھ سڑک پر سیدھا لیٹا تھا اور اس کا خون بہہ رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار گردن کو دائیں بائیں حرکت دی اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

خدا جانے وہ کون تھا۔ کہاں جا رہا تھا۔ اٹیچی کیس کی چیزیں لوٹ لی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی بہن کے لئے لاہور سے خریدی ہوئی چوڑیاں لے جا رہا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی بہن آج بھی ہندوستان کے کسی شہر میں اپنے بھائی کی راہ دیکھ رہی ہو۔

اس قسم کے قتل ہم نے بہت دیکھے تھے۔ میں نے امرتسر میں اسی طرح مسلمانوں کو سڑکوں پر سکھوں کی کرپانوں سے شہید ہوتے دیکھا تھا۔ ساحر لدھیانوی کا جی خراب ہونے لگا۔

"یار یہاں سے بھاگ چلو۔"

ہم ریلوے ہیڈ کوارٹر کی طرف کو نکلے ہی تھے کہ معلوم ہوا وہاں بھی سڑک پر کچھ نیم جان انسان شدید زخمی حالت میں پڑے ہیں۔ ایک زخمی کسی نہ کسی طرح اُٹھ کر کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے پیٹ کی نکلی ہوئی انتڑیاں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتا چند قدم ہی چلا ہو گا کہ پیچھے سے ایک سپاہی نے رائفل لوڈ کر کے اس کی پیٹھ کا نشانہ باندھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے فائر کر دیا۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی گولی اس بدنصیب کی پیٹھ پر لگ کر پھٹے ہوئے پیٹ میں سے نکل گئی اور وہ تھوڑا سا اُچھل کر گرا اور پھر نہ اُٹھ سکا۔

ساحر لدھیانوی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے میرا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سب کچھ اب نہیں دیکھ سکتا اے حمید۔ کسی طرح یہاں سے نکل چلو۔"

ریلوے سٹیشن کے ارد گرد کا علاقہ اتنا آباد اور گنجان نہیں تھا۔ سامنے اینٹوں، پتھروں سے اَٹا ہوا میدان سا تھا۔ ہم اس میں سے گزر کر میکلوڈ روڈ کی طرف نکل آئے۔ "چٹان" کے دفتر تک ہم نے خاموش رہ کر فاصلہ طے کیا۔ ہفت روزہ "چٹان" ابھی شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کے پہلے پرچے کی تیاری ہو رہی تھی اور شورش کاشمیری نے مجھ سے میرا افسانہ لے لیا تھا۔

شورش کاشمیری صاحب نے مجھے معاوضہ کے طور پر "بلیک اینڈ

وائٹ" سگریٹ کا ایک ڈبہ اور ایک ماچس لے دی تھی اور میں نے اسی پر اکتفا کیا تھا۔ کیونکہ چٹان توڑ کر معاوضہ کی رقم نکالنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

"چٹان" کے دفتر میں ابھی تک سوائے خوشنویس اور چپراسی کے کوئی بھی نہیں تھا۔ خوش نویس پہلے پرچے کی کاپیاں لکھنے میں مصروف تھے۔ یہاں سے نکل کر ہم چوک لکشمی سے ہوتے ہوئے ریجنٹ سنیما کے سامنے والی ایک منزلہ زرد رنگ کی پرانی کوٹھی کے احاطے میں آ گئے۔ یہاں فلمی ہفت روزہ" اداکار" کا دفتر تھا جس کا ایڈیٹر قتیل شفائی تھا۔ وہ بھی ابھی نہیں آیا تھا۔ مدیر مسئول عطاء اللہ ہاشمی صاحب بھی ابھی نہیں آئے تھے۔

"چلو ابن انشاء کے گھر چلتے ہیں۔"

"سویرا" کا نیا دفتر لکشمی چوک گیتا بھون کی دوسری منزل پر ہوتا تھا۔ نیچے پیراڈائز ریسٹورنٹ کھلا تھا۔

میں نے کہا۔

"یہاں بیٹھ کر ناشتہ کرتے ہیں، ہو سکتا ہے ابن انشاء بھی یہاں آ جائے۔"

پیراڈائز ریسٹورنٹ میکلوڈ روڈ کا کافی ہاؤس تھا۔ سبھی ترقی پسند ادیب اور شاعر اسی جگہ بیٹھتے تھے۔ ریسٹورنٹ کا مالک یوپی کا ایک

سُرخ و سپید دبلا پتلا نوجوان تھا جس کو شاعروں اور ادیبوں سے بڑی عقیدت تھی۔ شاید یہ اسی عقیدت کے اظہار کا ایک پہلو تھا کہ جب کسی شاعر یا افسانہ نگار کا بِل بڑھ جاتا تو وہ ریسٹورنٹ کے باہر لگے ہوئے تختۂ سیاہ پر اس شاعر یا ادیب کا نام لکھ کر آگے واجب الادا رقم درج کر دیتا تھا۔

پیراڈائز ریسٹورنٹ خالی تھا۔ نوکر فرش دھو رہے تھے۔ ہم اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد قمر اجنالوی آ گیا۔ اونچا لمبا، گھرے گنجان سیاہ بالوں والا۔ مٹھی میں سگریٹ دبائے زور سے کش لگا کر اس نے ہم دونوں کو دیکھا اور ہنستا ہوا ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"صبح دم دروازۂ خاور کھلا۔ چائے تو میں بھی پیوں گا کامریڈ!"

اتنے میں ابن انشاء بھی آ گیا۔

"ارے تم لوگ رات کے اسی جگہ بیٹھے لگتے ہو۔ کم بختو! اِس شہرِ دل فگار میں سورج تو نکل لینے دیا کرو۔"

ساحر لدھیانوی اداس تھا کیونکہ اس نے ریلوے اسٹیشن پر دو انسانوں کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔

قمر اجنالوی نے کہا۔

"سارے مشرقی پنجاب میں یہی کچھ ہو رہا ہے دوستو! اب کیا کیا جا سکتا ہے۔"

ابن انشاء ناک پر عینک جماتے ہوئے بولا۔

"ساحر! اس پر ایک نظم ضرور لکھنا۔"
اُسی رات ساحر لدھیانوی نے ایک نظم لکھی جس میں اس کا فن اور احساسات عروج پر تھے۔ وہ نظم اس کے دوسرے مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ یہ نظم "سویرا" کے شمارے میں چھپی اور ملک کے طول و عرض میں بہت پسند کی گئی۔

رائل پارک کی بلڈنگ ہم سے چھن گئی۔ عارف عبدالمتین نے پرانی انارکلی اور احمد راہی نے گوال منڈی میں مکان الاٹ کروا لیئے۔ فکر تونسوی کو لاہور چھوڑ کر ہندوستان جانا پڑ گیا۔ میرا خیال ہے فکر تونسوی اور کنہیا لعل کپور دو آخری غیر مسلم ادیب تھے جنہوں نے روتے ہوئے بادلِ نخواستہ لاہور کو الوداع کہی۔

ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والا "بھوت گھر" الاٹ ہو گیا۔ ہماری فیملی بھی لاہور آ گئی اور فیض باغ میں ایک مکان میں رہنا شروع کر دیا۔

ساحر لدھیانوی کا کمرہ نچلی منزل میں تھا۔ بلڈنگ خستہ حال تھی۔ دیواروں کا چُونا گر رہا تھا۔ اونچی چھت میں جالے لٹکے تھے۔ غسل خانے کی کھڑکی بند نہ ہوتی تھی۔ نلکے کی ٹوٹی سے پانی ہر وقت گرتا رہتا تھا۔ اس جگہ کھڑکی میں ٹوٹا ہوا شیشہ رکھ کر ساحر لدھیانوی شیو بنایا کرتا تھا۔ روشندان میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس عمارت

کے آگے ایک لان تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا۔ آجکل جو یہاں کڑاہی تکہ دانوں کے کھوکھے ہیں' پہلے یہاں نہیں تھے۔ سامنے "امروز" کا دفتر تھا جس کی ایک جانب کسی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی نے دفتر بنا رکھا تھا۔

ابن انشاء نے اسی بلڈنگ کی ایک انیکسی اَلاٹ کروالی تھی جس کی چھت سُرخ اور مخروطی تھی۔ یہ چینی طرز کا ایک منزلہ مکان آج بھی ویسا ہی ہے اور ابراہیم جلیس اسے چینی پگوڈا کہا کرتا تھا۔ ساحر کے کمرے میں صرف ایک چارپائی' ایک میز دو کرسیاں اور ایک پُرانی سی دری بچھی تھی۔ اندھیرا سا چھایا رہتا۔ گرمیوں میں یہ کمرہ بڑا ٹھنڈا اور سردیوں میں بہت زیادہ سرد ہوتا۔

دوپہر کے بعد میں اور ساحر ہفت روزہ "اداکار" کے دفتر میں گئے۔ قتیل شفائی پریس میں بھیجنے سے پہلے پرچہ کی کاپیاں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہمارے لئے چائے منگوائی اور انگلی کھڑی کر کے بولا۔

"صرف ایک منٹ"۔

خوش شکل نوجوان گھنے سیاہ بالوں والا سُرخ و سفید قتیل شفائی زندگی اور شعری استعداد سے بھرپور تھا۔ عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اس کی نظموں اور غزلوں میں طبقاتی تضاد سے پیدا ہونے

والے مسائل کا بھی بھرپور شعور ملتا تھا۔ اس کی غزل اس عہد کی نئی آواز تھی۔ چمکتے کھنکتے اور مترنم شعر کہتا تھا (اور آج بھی کہتا ہے) صاف اور کھری بات کرتا ہے اور کسی وقت ایسی جگت کرتا کہ ہم لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ساحر لدھیانوی "اداکار" کا پرانا شمارہ پڑھنے لگا۔

چائے آ گئی۔ قتیل نے کاپی پریس بھجوا دی اور سگریٹ ہماری طرف کر کے بولا۔

"یار! تم لوگ بڑے ہرجائی ہو۔ وعدہ کرتے ہو مگر بھاگ جاتے ہو۔ اگلی بار اگر تم دونوں نے اپنی کوئی چیز نہ دی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔"

قتیل شفائی کی ناراضگی ہمیں گوارا نہیں تھی۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔

"میں ایک نظم ضرور دوں گا۔ اے حمید سے تم بات کر لو کیونکہ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔"

قتیل نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں بھئی اے حمید! اب بات کرو مجھ سے۔"

"افسانہ تو نہیں، مزاحیہ مضمون کا پکا وعدہ کرتا ہوں۔"

"چلو ہو گئی بات۔ اب لو ایک عدد سگریٹ کا مجھے نقصان پہنچاؤ۔"

اسی شام کو ترقی پسند مصنفین کا اجلاس تھا جس میں ساحر پر ایک صاحب مقالہ پڑھنے والے تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ شکل یاد ہے۔ یہ صاحب پکے رنگ کے پختہ عمر کے تھے اور علی گڑھ سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ اسی دفتر میں ہمیں چار بج گئے۔ ہم تینوں "ادا کار" کے دفتر سے اٹھ کر سیدھے دیال سنگھ کالج کی لائبریری میں آ گئے جہاں انجمن کا ادبی اجلاس ہونے والا تھا۔ سبھی دوست جمع تھے۔ علی گڑھ والے صاحب نے ساحر لدھیانوی پر اپنا مقالہ پڑھا۔ بڑا پُر مغز مقالہ تھا۔ لیکن انہوں نے ساحر لدھیانوی کی رومانویت پر سخت تنقید کی تھی۔

ویسے بھی ترقی پسند مصنفین رومانیت کے جانی دشمن تھے۔ میرے افسانوں پر انہیں سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا تھا کہ میں ناریل کے درختوں اور بدھ مندر کی دیوداسیوں اور زرد گلابوں اور موتیوں کے گجروں کے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتا۔ ساحر لدھیانوی حالاں کہ اتنا زیادہ رومانٹک نہیں تھا اور اس کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی اور سماج سے بغاوت بدرجہ اتم ملتی ہے لیکن خدا جانے ان علی گڑھ والے صاحب کو ساحر کی آٹے میں نمک کے برابر رومان پسندی بھی کیوں گوارا نہ ہوئی۔

ساحر میرے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔

" اگر یہ صاحب میری کہانیوں پر مقالہ لکھتے تو شاید صرف اسی جملے

پر مقالہ شروع کر کے ختم کر دیتے تھے کہ اے حمید کے افسانوں میں کچھ نہیں ہے۔
ساحر لدھیانوی نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگاتے ہوئے کہا۔
"ابھی حدیثِ دل کی بہت تفسیریں لکھی جائیں گی پیارے۔"
ساحر لدھیانوی کو اپنی ہمہ گیر مقبولیت کا بھرپور احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عہد کی نئی نسل کا فیض احمد فیضؔ کے بعد وہی پسندیدہ ترین شاعر ہے۔ وہ فیضؔ صاحب کا بیحد احترام کرتا تھا اور ان کا مدّاح تھا۔ سیف الدین سیف کی شاعری کو وہ بڑے جذبے کی شاعری سمجھتا تھا۔ غزل میں قتیلؔ اور عبدالحمید عدمؔ کا ڈنکا بج رہا تھا۔
کالجوں میں مشاعرے ہوتے تو یہی لوگ مشاعرہ لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اُن ہی دنوں ساحرؔ نے ایک روز بڑی رازداری کے ساتھ ایک لڑکی کے بارے میں بتایا کہ وہ اس سے عشق کرتی ہے۔ میں نے ساحر لدھیانوی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ شرماتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور اس کے چہرے کے چیچک کے ہلکے ہلکے داغ شرم و حیا کی سُرخی میں گُم ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے پوچھا۔
"کیا تم بھی اس سے عشق کرتے ہو؟"
اُس کے ہونٹوں میں سگریٹ تھا۔ ہلکا سا کش لگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔
"کون کافر اس سے عشق نہیں کرے گا، وہ خوبصورت لڑکی ہے۔"

میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ وہ واقعی خوبصورت لڑکی تھی لیکن ساحر کے مقابلے میں بڑی ہوشیار تھی۔ وہ شعر بھی لکھتی تھی اور کبھی کبھی کالج کے مشاعروں میں حصہ بھی لیتی تھی۔ ساحر لدھیانوی اس کی غزلوں، نظموں کی اصلاح کر دیا کرتا تھا۔ اصلاح تو یونہی اک بہانہ تھا۔ ابنِ انشاء نے مجھے بتا دیا تھا کہ ساحر اس خاتون کو خود شعر لکھ کر دیتا ہے۔ میں اس خاتون کا یہاں نام نہیں لکھوں گا کیونکہ وہ آج پاکستان میں ایک اُونچے عہدے پر فائز ہے اور بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔

ایک روز میں ابنِ انشاء کے چینی مندر سے اٹھ کر ساحر کی طرف گیا تو وہ غسل خانے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے آگے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا تھا۔ مجھے شیشے میں سے اس کی ایک آنکھ نظر آئی۔

"وہ چینی بھکشو کہاں ہے؟"

ساحر لدھیانوی کا مقصد ابنِ انشاء سے تھا۔ میں نے ساحر کے پلنگ پر بیٹھ کر نیوٹائمز کا تازہ شمارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی اپنے ٹوٹے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا رگڑ رگڑ کر شیو بنا رہا ہے۔"

ساحر تولیے سے مُنہ پونچھتا ہوا غسلخانے سے باہر آیا۔ وہ گنگنا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"آج یہ تیاری کس کے لئے ہو رہی ہے۔ کیا اُس سے تو ملنے۔

نہیں جا رہے ؟"

ساحر لدھیانوی مسکرانے لگا۔

"میں پتلون پہن کر ابھی آیا۔"

میں نے کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"پتلون پہن کر آتا ہوں۔ پھر سوال کا جواب دوں گا۔"

تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ اس نے کریم کلر کی ٹھنڈی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے کالے سیاہ بال پیچھے کو جمے ہوئے تھے اور چمک رہے تھے۔ بسکٹ رنگ کی پوری آستین کی بُشرٹ نے اس کی پتلی باہوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے کارنس پر رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھا اور جھک کر آئینے میں اپنا چہرہ تکنے اور بالوں میں ایک بار پھر کنگھی پھیرنے لگا۔ میں نے رسالہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ارادے کیا ہیں آج ؟"

"آؤ میرے ساتھ۔"

اور میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر احاطے کی روش پر سے ہو کر دوسری طرف ایبٹ روڈ پر آ گیا۔

"ابنِ انشا کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

"ارے خدا کا نام لو اے حمید۔"
ساحر نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔
"اُس کو تو بالکل خبر نہیں کرنی"۔
"کس بات کی؟" میں نے پوچھا۔
ساحر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"تم آؤ تو سہی"

چیرنگ کراس میں جہاں آج کل واپڈا کی عظیم الشان بلڈنگ کھڑی ہے، وہاں اُن دنوں مشہورِ زمانہ "میٹرو ہوٹل" ہوا کرتا تھا۔ اس ہوٹل کے بارے میں پھر آپ سے بات کروں گا۔ اس وقت میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ اس ہوٹل میں داخل ہو رہا ہوں۔ گارڈینیا بیل کا سرسبز چھوٹا سا محرابی دروازہ عبور کر کے ہم میٹرو ہوٹل کے لان کی روش پر بید کی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دن کے دس بجے تھے۔ یہاں شام کو رونق لگتی تھی۔ ابھی سوائے ہمارے کوئی گاہک نہ آیا تھا۔ میوزک ڈائس خالی تھا۔ ایک بیرے نے ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمارے پاس آگیا تھا۔

ساحر لدھیانوی نے کہا۔
"چائے لے آؤ بھائی"۔
بیرا چائے لینے چلا گیا۔ ساحر نے سگریٹ کی ڈبی کھولی۔ ایک عدد

سگریٹ مجھے دیا۔ ایک خود سلگایا اور کش لگا کر ماچس کی تیلی موتیے کی جھاڑیوں میں پھینکی اور بڑے پُراسرار انداز میں دیکھ کر میری طرف مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔

"دیکھو ساحر! عشق معاشقہ میرے لئے کوئی پُراسرار شے نہیں ہے۔ میں امرتسر سے عشق کرتا آیا ہوں اور یہاں بھی عشق کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ مرض پہلی بار لاحق نہیں ہوا۔ مجھے حمید اختر اور ابن انشا نے بتا دیا تھا کہ لدھیانہ میں بھی لڑکیاں تم پر مرا کرتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تم کسی کو نہیں مار سکے۔ اس لئے جو کچھ اس وقت تمہارے دل میں ہے، اسے بیان کر دو۔ ہو سکتا ہے میں تمہیں کوئی عمدہ مشورہ دے سکوں۔"

ساحر لدھیانوی نے کہا۔

"اسی لئے تو میں تمہیں ساتھ لایا ہوں۔ بات یہ ہے کہ......"

بات یہ تھی کہ اسی خاتون سے آج میٹرو ہوٹل کے ایک کمرے میں ملاقات کرنے والا تھا جس کو شعر لکھ کر دیا کرتا تھا۔ ویسے تو ساحر کی اس سے روز ملاقات ہوتی تھی لیکن تنہائی میں دونوں کی شاید پہلی ملاقات تھی۔ ساحر اکیلے میں اس خاتون سے ملتے ہوئے کچھ گھبرا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کمرہ کس کا ہے؟"

"سلیم شاہد کا۔"

سلیم شاہد ایک عرصہ سے بی بی سی لندن میں ہیں۔ ہمارے بزرگ دوست تھے اور دوستوں کے لئے بڑا ایثار کرتے تھے۔ وہ میٹرو ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ساحر لدھیانوی نے ان سے ذکر کیا تو انہوں نے اپنے کمرے کی چابی ساحر کے حوالے کر دی اور کہا۔

"ڈپلی کیٹ میرے پاس ہے۔ میں کل صبح دس بجے سے لے کر چار بجے تک اپنے کمرے میں نہیں ہوں گا۔"

ساحر لدھیانوی نے پتلون کی پچھلی جیب سے چمکتی ہوئی چابی نکال کر مجھے دکھائی۔

"چابی میرے پاس ہے۔"

"وہ کس وقت آ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گیارہ بجے۔"

"اُسے سلیم شاہد کے کمرے کا علم ہے؟"

"ہاں۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟ بھاگنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

ساحر لدھیانوی سوچ میں پڑ گیا۔ میں آج بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت بھاگ جانا چاہتا تھا کیونکہ بعد میں جب وہ بمبئی گیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ کئی مقامات پر بھاگ گیا تھا۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھاگے۔ میں نے اس کی ہمت بندھائی کہ اگر اُس نے بزدلی کا

مظاہرہ کیا تو ایک شریف خاتون کا دل ٹوٹ جائے گا۔ لہٰذا اسے ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ باقی مجھے یقین تھا کہ وہ خاتون ساحر کو سنبھال لے گی۔ کیونکہ میں اسے جانتا تھا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میں بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔

ساحرلدھیانوی کو سلیم شاہد کے کمرے میں چھوڑ کر میں نیچے ہوٹل کے لان میں آیا تو وہ خاتون اُس زمانے کے قیمتی سینٹ میں بسی بہترین لباس زیب تن کئے ہوٹل کے باہر تانگے سے اُتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر رُک گئی۔ میں نے آداب کہا۔ وہ کچھ ٹھٹھکی، پھر مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

"لندن سے میری ایک سہیلی آئی ہوئی ہے۔ اُس سے ملنے آئی ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد ساحر نے پوچھا۔

"اور کیا حال ہے؟"

خاتون نے مسکرا کر کچھ اور حال بتایا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

ساحرلدھیانوی نے ایک بار پھر پوچھا۔

"اور سُنایئے اور کیا حال ہے؟"

خاتون نے تھوڑا سا اور حال بتا دیا۔ اس کے بعد اس کا حال ختم ہو گیا۔ اس کے بعد خاتون نے ساحرلدھیانوی کا مزید حال پوچھنا شروع کر دیا۔

"اور کیا حال ہے آپ کا؟"
"بس جی آپ کی دعائیں ہیں۔"

اور جب ساحر لدھیانوی کے پاس بھی اپنا حال بتانے کے لئے کچھ نہ رہا تو خاموش .... دونوں خاموش ہو گئے۔ خاتون بڑی چالاک تھی۔ اُس نے ساحر سے تازہ غزل کی فرمائش کر دی۔

"کینرڈ کالج میں بزم خواتین کا مشاعرہ ہے، کوئی اچھی سی غزل لکھ دیں ناں۔"

"کیوں نہیں۔ ابھی لکھے دیتا ہوں۔"

اور ساحر لدھیانوی نے ایک خوبصورت خاتون کے ہوتے ہوئے بھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرنا شروع کر دیا۔ اس سے زیادہ بدقسمت شاعر اور کون ہو گا بھلا!

ساحر لدھیانوی کے لئے غزل کہنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اُس نے دس پندرہ منٹ میں بڑی اچھی غزل کہہ دی۔

"آپ کیسے ہیں؟"

میں تو ٹھیک تھا۔ ہاں ساحر لدھیانوی کی فکر ضرور تھی جسے میں اوپر کمرے میں اکیلا چھوڑ آیا تھا۔ خاتون مجھ سے دو چار جھوٹ بول کر اوپر چلی گئی۔ میں نے احتیاطاً ہوٹل کے پچھواڑے جا کر تسلی کر لی کہ کہیں ساحر نے کمرے کی کھڑکی میں سے نیچے چھلانگ تو نہیں لگا دی۔ ساحر

ابھی تک کمرے میں ہی تھا۔ بڑی اچھی بات تھی۔ کم بخت لاہور کے رومانوی شاعروں کے نام ڈبونے پر تُلا ہوا تھا۔

دوپہر کے بعد میں پیراڈائز ہوٹل خاص طور پر ساحر کو دیکھنے اور اس سے معرکۂ عشق کی روئیداد سننے کے لئے گیا۔ ساحر لدھیانوی ابھی نہیں آیا تھا۔ ظہیر کاشمیری اپنی سنہری گندی مندی انگلی فضا میں اٹھائے کالج کے چند لڑکوں کو اپنی نظم سُنا رہا تھا۔ میں وہاں سے ساحر کے گھر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی ابھی آیا ہے۔

"کیا ہوا پھر؟" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کر دیا۔

وہ سر کو جھٹک کر بولا۔

"یار وہ تو کوئی آدمی ہے عورت نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ تو .... وہ تو ...."

ساحر لدھیانوی نے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی کہ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی، ساحر نے اُٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے گھر والوں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کا حال پوچھا۔ وہ ایک ایک کا حال بتاتی چلی گئی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ساحر لدھیانوی بھی چُپ ہو گیا اور غزل آگے بڑھا دی۔

خاتون نے غزل پسند کی اور کہا "ایک غزل اور لکھ دیجئے ناں۔

اگر لڑکیوں نے دوسری غزل کی فرمائش کر دی تو کیا کروں گی۔ پُرانی غزل سنانے کو دل نہیں چاہتا میرا۔"

"ابھی لکھے دیتا ہوں دوسری غزل بھی۔"

اور ساحر لدھیانوی نے دوسری غلطی کرنی شروع کر دی۔ اس کے بعد ساحر نے دو تین غلطیاں اور کیں اور خاتون کو دو نظمیں بھی لکھ عطا کر دیں پھر اُس نے کھانا منگوایا اور دونوں نے مل کر کھایا۔ کھانے کے بعد خاتون نے انگڑائی لی اور کہا:

"میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

ساحر لدھیانوی نے ایک بار پھر غلطی کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں، آپ آرام کریں۔"

"جیسے آپ کی مرضی!"

اب ایک شریف خاتون جو بد معاشی میں بھی شرافت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہتی تھی، اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خاتون اکیلی سو گئی اور ساحر لدھیانوی کمرے سے نکل کر گھر آ گیا۔

آتی دفعہ کہہ آیا کہ چابی فلاں بیرے کو دے دیجئے گا۔"

میں نے ساحر سے کہا۔

اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم عورت ہو مگر یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ خاتون مرد تھی۔

ساحر نے جھنجھلا کر کہا۔

"کم بخت مردوں کی طرح روٹی کے نوالے کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھاتی تھی اور بوٹی کی ہڈی تک کچر کچر چباتی تھی۔ اس کے منہ سے کڑ کڑ کی آواز نکلتی تھی۔

"تم کیا چاہتے تھے کہ کس قسم کی آواز آنی چاہیئے اُس کے مُنہ سے۔"

ساحر لدھیانوی نے گردن کھجلاتے ہوئے کہا۔

"بس یار مجھے تو وہ کھانا کھاتے ہوئے زہر لگ رہی تھی۔"

"جب وہ کھانا نہیں کھا رہی تھی تو تم کیا کر رہے تھے اُس وقت؟"

"اُس کے لئے شعر لکھ رہا تھا۔"

میں نے کہا۔

"بس پیارے پھر شعر ہی لکھا کرو گے ساری عمر۔"

ساحر نے سگریٹ سُلگایا اور ناک سکیڑ کر بولا۔

"ایک اور بڑی بُری حرکت کی اُس نے۔"

وہ بھی بیان کر دو۔"

"وہ یہ کہ جب میں دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اس کے خراٹوں کی آواز سُنی تھی۔"

بہر حال یہ ساحر لدھیانوی کی اپنی نازک مزاجی تھی۔ شاعرانہ مزاج تو اس کا ضرور تھا۔ ذکی الحس بھی تھا اور خوبصورت عورت کے خراٹے

تو بڑے سے بڑا خرانٹ آدمی بھی کم ہی برداشت کرتا ہوگا۔ اس معاملے میں ساحرؔ سچا تھا۔ وہ کئی معاملوں میں سچا تھا۔

ان ہی دنوں انقلابی نظمیں لکھنے کی وجہ سے ساحرؔ کے پیچھے سی آئی ڈی لگ گئی۔ وہ ڈرپوک ہونے کی حد تک امن پسند تھا۔ چنانچہ گھر سے بہت کم باہر نکلتا۔ انہی دنوں کیفیؔ اعظمی لاہور آ گیا۔ کیفیؔ کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس اور پیراڈائز میں محفلیں سجنے لگیں۔ حمید اختر یہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن ساحرؔ کم باہر گھر سے نکلتا تھا۔ ہم نے اسے بہتیرا سمجھایا کوئی ایسی بات نہیں ہے لیکن اسے کچھ زیادہ ہی ڈرایا اور دھمکایا جا رہا تھا۔

اصل میں لاہور کی دو مشہور شخصیتیں ساحرؔ کے خلاف سازش کر رہی تھیں کہ کسی طرح وہ پاکستان سے چلا جائے۔ انہوں نے ساحرؔ کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ اخباروں اور ہفت روزہ رسالوں میں ساحرؔ کے خلاف اس کی بعض نظموں کے حوالے سے مضامین شائع ہو رہے تھے۔ کالم لکھے جا رہے تھے۔ ساحرؔ لدھیانوی نے ایک روز گھبرا کر بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے، ابن انشاء اور حمید اختر نے اسے بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے خلاف یہ مہم ایک پلان کے تحت چلائی جا رہی ہے۔ اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ مگر ساحرؔ کے پاؤں لاہور کے میدان سے اُکھڑ چکے تھے۔ ہم اسے بار بار سمجھاتے کہ لاہور سے نہ جائے۔ وہ بار بار یہی کہتا۔

"نہیں اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

کیفی اعظمی بمبئی جاچکا تھا۔ اُس نے بمبئی سے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ پیارے بس آجاؤ۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔

ہم نے ایک بار پھر ساحر کو بمبئی جانے سے روکا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی تھی کہ وہ ہماری نصیحتوں پر عمل نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ ہماری نصیحتوں پر عمل کرلیتا اور بمبئی نہ جاتا تو شاید آجکل اس کی قبر بھی میانی صاحب قبرستان میں ساغر صدیقی کے آس پاس ہی بنی ہوتی۔ اور یہاں تو اس کا عرس منانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کیونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اراکین قبروں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ایک روز ہم ساحر لدھیانوی کو الوداع کہنے والٹن ایئرپورٹ جا رہے تھے۔

ابھی لاہور کا ہوائی اڈہ تعمیر نہیں ہوا تھا اور قبل از مسیح کے فوکر طیارے والٹن کے ہوائی اڈے سے اُڑا کرتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بڑی مشکل سے اُڑا کرتے تھے۔

ساحر لدھیانوی نے ٹنڈ کروا رکھی تھی اور فیلٹ ہیٹ کھینچ کر کانوں تک پہن رکھی تھی۔ وہی پُرانا پھٹا ہوا کوٹ زیب تن تھا جس کو میں اور احمد راہی باری باری پہنا کرتے تھے۔ ہوائی اڈے پر بھی وہ کسی ملک کے بڑے اہم جاسوس کی طرح بار بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ

کوئی اُس کے پیچھے تو نہیں لگا ہوا۔
حمید اختر نے کہا۔
"اوئے کمینے! اگر پیچھے لگا بھی ہو گا تو اب تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔"
ساحر لدھیانوی نے سوکھا لمبا جسم جھکا جھکا کر ہم سب سے ہاتھ ملایا اور میلے کچیلے اوورکوٹ کے ساتھ سب سے باری باری بغل گیر ہوا۔ ہم میں سے کسی دوست نے مذاقاً کہا۔
"ساحر! اب بھی وقت ہے واپس آجاؤ۔ مت لاہور چھوڑ کر جاؤ..."
لیکن ساحر لدھیانوی کی قسمت یاوری کر رہی تھی۔ وہ فوکر جہاز میں سوار ہو گیا اور جہاز کے دونوں پنکھے طوفانی گردش میں آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہوائی جہاز لاہور کی فضا سے نکل کر بمبئی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔
بمبئی جا کر ساحر لدھیانوی کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن اور سُنہری دَور شروع ہوتا ہے۔
فلم "ٹیکسی ڈرائیور" نے اس کی زندگی کو کامیابی اور عروج کی راہ پر ڈال دیا۔ دیکھتے دیکھتے ساحر لدھیانوی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ جن لوگوں نے اس کے زوال کے خواب دیکھے تھے اور اُسے ذلیل و رُسوا کرنے کی کوشش کی تھی وہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے تھے۔
ساحر لدھیانوی ایک بار دہلی آیا تو ہم نے سُنا کہ اس نے اپنی نئی کار بھی ریل گاڑی میں ساتھ ہی رکھوائی تھی تا کہ دہلی میں اُسے سواری کی دِقّت نہ ہو۔

ہم نے سُنا تو خوش ہوئے کہ ساحر نے اچھا کیا جو دہلی کے پبلشروں کے آگے ایک شاعر کی حیثیت کو بلند کر کے دکھایا۔ آخر شاعر اور ادیب کے پاس کار کیوں نہیں ہو سکتی ؟

پھر وقت گزرتا چلا گیا اور ساحر لدھیانوی کامیابی کی منزلیں طے کرتا ایک مقام پر جا کر اطمینان سے سکون پذیر ہو گیا۔ کبھی کبھی اس کا کوئی خط لاہور کے دوستوں کے نام آجاتا۔ کبھی یہاں کے دوست بمبئی جا کر اُسے مل آتے۔

واپس آکر بتاتے کہ ساحر نے بمبئی میں ایسے فلیٹ بنوا رکھے ہیں جہاں ہندوستان اور پاکستان کا کوئی بھی ادیب و شاعر جا کر جب چاہے ٹھہر سکتا ہے۔

پچھلے دنوں سُنا کہ ساحر پر دل کا دَورہ پڑا ہے۔ دل کا دورہ تو اُسے پڑنا ہی تھا۔ اُس نے زندگی میں کام ہی ایسے کئے تھے۔ حال ہی میں ایک دوست نے بمبئی سے آکر بتایا۔

” وہاں سب ادیب اپاہج ہو گئے ہیں۔ ساحر چل پھر نہیں سکتا۔ کیفی اعظمی وہیل چیئر پر بیٹھتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کسی آدمی کے کندھے کا سہارا لیکر سٹوڈیوز میں آتا ہے۔ خدا بچائے بمبئی سے۔“

ایسی بمبئی سے خدا ساحر لدھیانوی کو محفوظ رکھے جو مہندر ناتھ اور کرشن چندر کو بھی کھا گئی۔

حمد

اس جانِ دو عالم کا جلوہ
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے
مشتاق نگاہوں کا کعبہ
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے

بے چین رہے عاشق کی نظر
تھوڑی سی مگر تسکین بھی ہو
اُس پردہ نشیں کا یہ منشا !
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے

کیا حُسنِ زمیں کیا رنگِ فلک
سب اُس کے کرشمے کی ہے جھلک
تاروں میں بسا ہے نور اُس کا
پھولوں میں بسا ہے رنگ اُس کا
یہ رُوپ میں شامل رُوپ اُس کا
یہ ڈھنگ میں شامل ڈھنگ اُس کا
اوّل بھی وہی آخر بھی وہی
اوجھل بھی وہی ظاہر بھی وہی
منصور وہی سرمد بھی وہی
لاحد بھی وہی اور حَد بھی وہی
شعلہ بھی وہی شبنم بھی وہی
سچ یہ ہے کہ ہیں خود ہم بھی وہی
مخلوق سے خالق کا رشتہ
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی

وہ مالکِ کُل، محبوب مرا
سُنتا ہے ہر اک دھڑکن کی صدا

جب اس کا اشارہ ہوتا ہے
تقدیر سنورنے لگتی ہے
مدت سے ترستے خوابوں کی
تعبیر اُبھرنے لگتی ہے
سجدے میں جھکا کر سر اپنا
مانگے جو کبھی انسان دُعا
ہو جاتی ہے ہر مشکل آساں
مل جاتی ہے دردِ دل کی دَوا
ہے اُس کی یہ خاص الخاص اَدا
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی
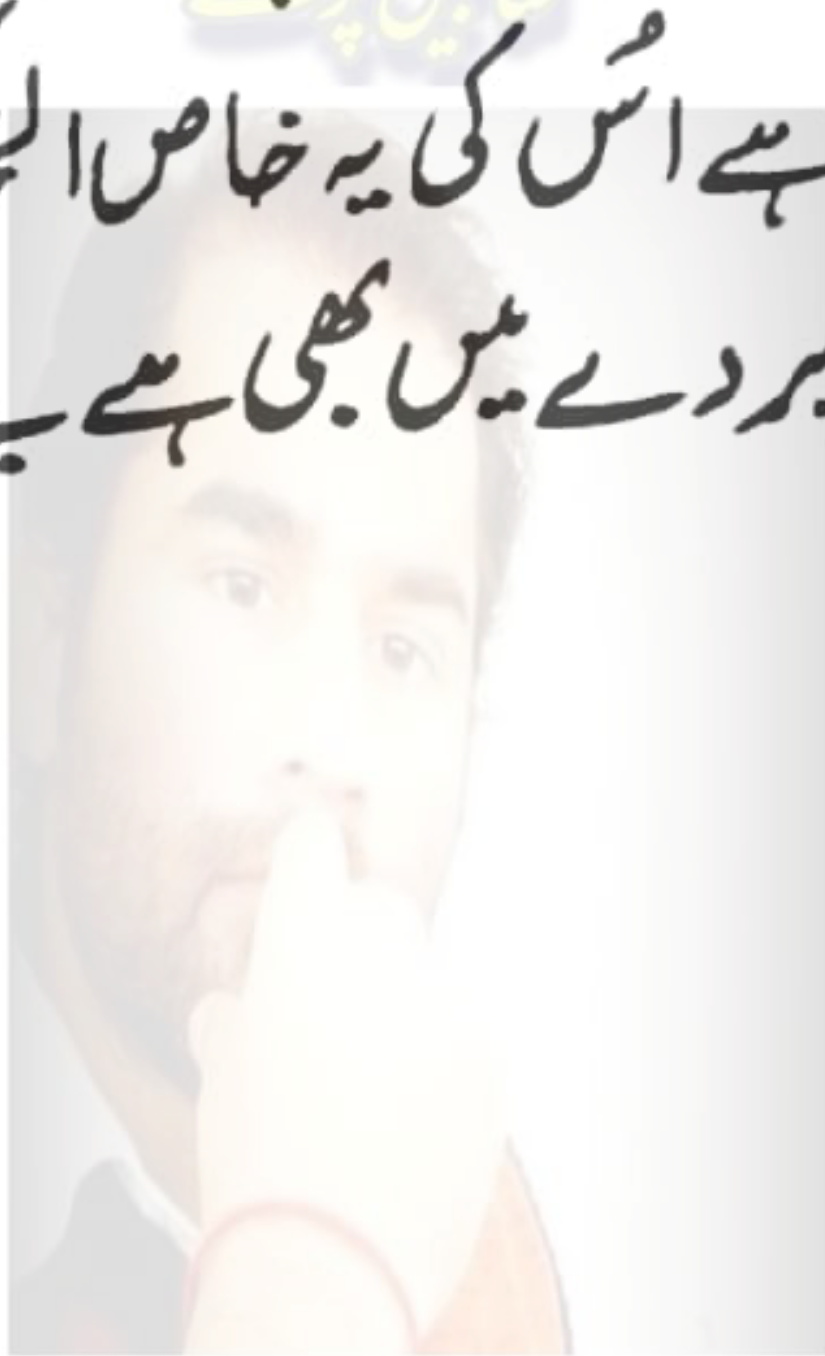
حسنِ فطرت

کلکِ صفت کی ہے نقاشی خطِ تقدیر میں
حرفِ 'کُن' ہے جلوۂ کونین اس تحریر میں

ہیں حجاب و جلوہ روشن حسنِ عالمگیر میں
جسم و جاں ہیں جلوۂ جانانہ اِس تنویر میں

تھا حجابِ ہفت منزل پردہ دارِ رازِ عشق
حسنِ یوسف جلوہ گر تھا پردۂ تقدیر میں

تھی حجابِ جلوۂ جاناں نگاہِ شوقِ دید
جلوہ بے ذوقِ نظر تھا عالمِ تنویر میں

دیکھ کر حسنِ عقیدت رندِ مے آشام کا
ساقیانِ بزمِ جم ہیں جلوۂ تنویر میں

قطرۂ شبنم سے روئے گُل ہے پاک اور تابناک
آتشِ گل سے چمن ہے جلوۂ تنویر میں

داغِ عصیاں دھو دیا اشکِ ندامت نے مرے
ہو گئی تر دامنی گمُ اشکِ دامن گیر میں

سوزِ الفت نے کیا ہے دل کو آلائش سے پاک
خاکساری جلوہ گر ہے صورتِ اکسیر میں

خالِ مشکیں ہے سوادِ چشمِ دل آئینہ تاب
پُرضیا ہے مصحفِ رخسار کی تفسیر میں

اب تمنائے گل و گلشن سے ہے افسردگی
ہے بہارِ بے تمنائیٔ دلِ دلگیر میں

جلوہ ہائے گل سے ہے ساحرؔ وہ فردوسِ بریں
اک بہارِ بے خزاں ہے گلشنِ کشمیر میں

بھجن

او پرانی رے پرانی رے
تیری کرم کہانی
تیری آتما بھی جانے ، پرماتما بھی جانے
کہاں چھپے گا رے پرانی
تیری آتما بھی جانے، پرماتما بھی جانے
کتنے ہی پردوں میں پاپ کمائے تو
کتنے ہی جتنوں سے بھید چھپائے تو
بھلے بُرے کی کہانی ، پرانی رے ...
تیری آتما بھی جانے ، پرماتما بھی جانے

جگ جسے کہتے ہیں، کرموں کی کھیتی ہے
جیسا کوئی بوئے اُسے ویسا پھل دیتی ہے
تو نے بویا کیا تھا پرانی
تیری آتما بھی جانے، پرماتما بھی جانے
تیری کرم کہانی ، تیری آتما....
پربھو کے دوارے تیرا آنا ہی بہت ہے
بول کہ نہ بول پچھتانا ہی بہت ہے
جو ہے بیتا سُنائی، پرانی رہے
تیری آتما بھی جانے....
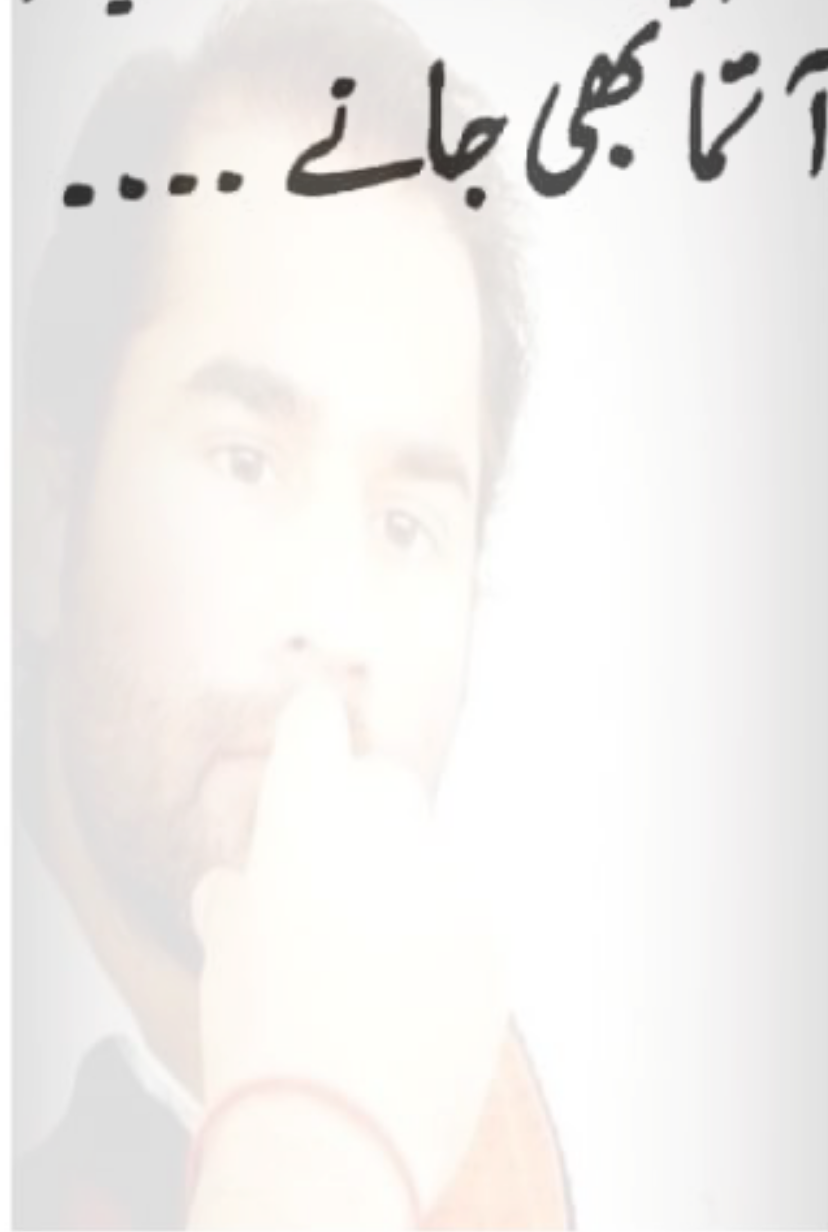
بھجن

میری سُن لے عرض بنواری
تیرے دوار کھڑی دُکھیاری

آر نہ سُوجھے پار نہ سُوجھے
اب کوئی دُوجا دوار نہ سُوجھے
کون ٹھکانے جاؤں پربھو میں
چھوڑ کے شرن تہاری
تیرے دوار کھڑی دُکھیاری

چھن گیا میری آس کا موتی
کھو گئی اِن نینن کی جوتی
تیرے جگت میں بھٹک رہی ہوں
میں ممتا کی ماری
تیرے دوار کھڑی دُکھیاری

میری سُن لے عرض بنواری
تیرے دوار کھڑی دُکھیاری

بھجن

کام، کرودھ اور لوبھ کا مارا جگت نہ آیا راس
جب جب رام نے جنم لیا تب تب پایا بن باس

کلجگ تک چلتی آئی ہے ست جگ کی یہ ریت
سب کچھ ہار چکے جب اپنا تب ہے رام کی جیت
جگ بدلے پر بدل نہ پایا اب تک یہ اتہاس

چھوڑ کے اپنے محل دو محلے جنگل جنگل پھرنا
اوروں کے سکھ چین کی خاطر دکھ سنکٹ میں گھرنا

ہے یہی رام کے لیکھ کی ریکھا آ گیا اب وشواس

رام ہر اک جگ میں آئے پر کون انہیں پہچانا
رام کی پوجا کی جگ نے پر رام کا ارتھ نہ جانا
تکتے تکتے بوڑھے ہو گئے دھرتی اور آکاس

بھجن

ہے روم روم میں بسنے والے رام
جگت کے سوامی ہے انتریامی
میں تجھ سے کیا مانگوں

آس کا بندھن توڑ چکی ہوں
تجھ پر سب کچھ چھوڑ چکی ہوں
ناتھ مرے میں کیوں کچھ سوچوں
تو جانے تیرا کام
جگت کے سوامی ہے انتریامی
میں تجھ سے کیا مانگوں

تیرے چرن کی دھول جو پائے
وہ کنکر ہیرا ہو جائے
بھاگ مرے جو میں نے پایا
ان چرنوں میں رام
جگت کے سوامی ہے انتریامی
میں تجھ سے کیا مانگوں

بھید ترا کوئی کیا پہچانے
جو تجھ سا ہو وہ تجھے جانے
تیرے کئے کو ہم کیا دیویں
بھلے بُرے کا نام
جگت کے سوامی ہے انتریامی
میں تجھ سے کیا مانگوں

محفلِ رقص و سرود

شب مرے کالج کی وادی رشکِ کوہِ طور تھی
حسن کی تابانیوں سے ہر روش پُرنور تھی

منعقد تھی ہال میں اک محفلِ رقص و سُرود
ہو رہا تھا نازنینانِ تمدّن کا ورود

رُخ پہ رقصاں مستیاں، لب گلفشاں، رفتار تیز
جلوے آوارہ، جبیں تاباں، نگاہیں بادہ ریز

قمقموں کی روشنی میں جھلملاتی ساڑھیاں
جیسے لہراتی ہوں دامانِ اُفق پر بجلیاں

آنچلوں کی سرسراہٹ سے فضا میں ارتعاش
گفتگو سے شیشۂ تقدیسِ مشرق پاش پاش

آ رہی تھیں نازک اندامی سے بل کھاتی ہوئیں
ہر روش پر برق کی مانند لہراتی ہوئیں

لگ رہی تھی چار سُو تانگوں کی اور کاروں کی بِھیڑ
مغربی طرزِ تمدّن کے پرستاروں کی بِھیڑ

ٹولیاں باندھے چلے آتے تھے بے فکرے جواں
ہو رہا تھا بزمِ کالج پر تھیٹر کا گُماں

لوگ آئے تھے نشاطِ دل کا ساماں دیکھنے
مرکزِ تعلیم و فن میں رقصِ خوباں دیکھنے

تالیوں سے گُونج اُٹھتی تھی فضا ہر تال پر
وجد آگیں کیفیت طاری تھی سارے ہال پر

وائلن لے لے کے نکلی تھیں وطن کی بیٹیاں
ناز سے گاتی ہجومِ مرد و زن کے درمیاں

جن کے آبا کٹ مَرے قوموں کی عزّت کے لئے
ناچتی ہیں بیٹیاں اُن کی حکومت کے لئے

خوش ہو اے برطانیہ کے حاکمِ ذی احتشام
تیرے ہاتھوں میں ہے مشرق کے تمدّن کی لگام

خوش ہو اے چرخِ چلی! کہ اب اس سرزمیں کے نونہال
کھو چکے ہیں صف شکن اسلاف کا جاہ و جلال

لُٹ کے بھی یہ ناچتے اور گیت گاتے جائیں گے
ظُلم سہہ کر عافیت کی تان اُڑاتے جائیں گے

ترانۂ حرّیت

ساؔحر لدھیانوی کی یہ تخلیق ۴۱ سال قبل ہوشیارپور سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'کیلاش' میں شائع ہوئی تھی۔ ساحر اُن دنوں گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے طالب علم تھے اور اے۔ ایچ۔ ساحر کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

بھڑک رہی ہے زمانے میں آتشِ نمرود
خدا کو ہے ترے ایماں کا امتحاں مقصود

اُٹھ اور اُٹھ کے بدل دے نظامِ عالم کو
کہ ہے یہ نیک گھڑی اور ساعتِ مسعود

وطن میں جی کے وطن کے لئے جو مر نہ سکیں
مری نظر میں ہیں ایسے وجود "ننگِ وجود"

وہ قوم فلسفۂ حرّیت کو کیا سمجھے
خدا بھی جس کا کہ دیر و حرم میں ہو مسدود

تغیرات یہ بنیاد ہے زمانے کی
جو شہریار تھا کل اب ہے بندۂ مطرود

اُبھارتا ہے جو مظلوم کو تشدّد پر
وہی ہے میرا پیمبر، وہی مرا معبود

ہے جن کو خوفِ تلاطم وہ میرا ساتھ نہ دیں
مجھے ہے طاقتِ طوفاں کا امتحاں مقصود

ورثہ

یہ وطن، تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

کتنے ذہنوں کا لہو، کتنی نگاہوں کا عرق
کتنے چہروں کی ضیا، کتنی جبینوں کی شفق
خاک کی نذر ہوئی تب یہ نظارے نکھرے

پتھروں سے یہ تراشے ہوئے اصنام جواں
یہ صداؤں کے خم و پیچ، یہ رنگوں کی زباں
چمنیوں سے یہ نکلتا ہوا پُر پیچ دھواں

تیری تخلیق نہیں ہے، میری تخلیق نہیں
ہم اگر ضد بھی کریں اس پہ تو تصدیق نہیں

علم سولی پہ چڑھا تب کہیں تخمینہ بنا
زہر صدیوں پیا تب کہیں نوشینہ بنا
سینکڑوں پاؤں کٹے تب کہیں اِک زینہ بنا

تیرے قدموں کے تلے، یا مرے قدموں کے تلے
نوعِ انساں کے شب و روز کی تقدیر نہیں
یہ وطن تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

تیرا غم کچھ بھی سہی، میرا الم کچھ بھی نہیں
اہلِ ثروت کی سیاست کا ستم کچھ بھی سہی
کل کی نسلیں بھی کوئی چیز ہیں ہم کچھ بھی سہی

اُن کا ورثہ ہوں کھنڈر، یہ ستم ایجاد نہ کر
تیری تخلیق نہیں جو اسے برباد نہ کر

جس سے دہقان کو روزی نہیں ملنے پاتی
میں نہ دوں گا تجھے وہ کھیت جلانے کا سبق
فصل باقی ہے تو تقسیم بدل سکتی ہے
فصل کی خاک سے کیا مانگے گا جمہور کا حق

پل سلامت ہے تو تو پار اُتر سکتا ہے
چاہے تبلیغ بغاوت کے لیئے ہی اُترے

ورنہ غالب کی زباں میں مرے ہمدم مرد دست
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ

سوچ لے پھر کوئی تعمیر گرائے
تیری تعمیر سے ہے جنگ کہ تخریب سے جنگ

اہلِ منصب ہیں غلط کار تو ان کے منصب
تیری تائید سے ڈھالے گئے تو مجرم ہے
میری تائید سے ڈھالے گئے میں مجرم ہوں

پٹڑیاں ریل کی، سڑکوں کی بسیں، فون کے تار
تیری اور میری خطاؤں کی سزا کیوں بھگتیں

اُن پہ کیوں ظلم ہو جن کی کوئی تقصیر نہیں
یہ وطن تیری میری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے
تیرا شکوہ بھی بجا میری شکایت بھی درست
رنگِ ماحول بدلنے کی ضرورت بھی درست

کون کہتا ہے کہ حالات پہ تنقید نہ کر

حکمرانوں کے غلط دعوؤں کی تردید نہ کر

تجھ کو اظہارِ خیالات کا حق حاصل ہے

اور یہ حق ___ کوئی تاریخ کی خیرات نہیں

تیرے اور میرے رفیقوں نے لہو دے دے کر

ظلم کی خاک میں اس حق کا شجر بویا تھا

سالہا سال میں جو برگ و ثمر لایا ہے

اپنا حق مانگ مگر ان کے تعاون سے نہ مانگ

جو ترے حق کا تصور ہی فنا کر ڈالیں

ہاتھ اُٹھا اپنے، مگر ان کے جلو میں نہ اُٹھا

جو ترے ہاتھ ترے تن سے جدا کر ڈالیں

خوابِ آزادیٔ انساں کی یہ تعبیر نہیں

یہ وطن، تیرے مرے ہی نسل کی جاگیر نہیں

وطن کی آبرو

چائنا کے ساتھ دوران جنگ میں فلم انڈسٹری کی نیشنل ڈیفنس کونسل نے ساحر لدھیانوی سے یہ ترانہ لکھوایا تھا اور ھدایت کار محبوب خاں نے دلیپ کمار، راجندر اور راج کمار پر یہ گانا فلما کر ایک ڈاکیومینٹری بنائی تھی۔

وطن کی آبرو خطرے میں ہے، ہشیار ہو جاؤ
ہمارے امتحاں کا وقت ہے، تیّار ہو جاؤ

ہماری سرحدوں پہ خون بہتا ہے جوانوں کا
ہُوا جاتا ہے دل چھلنی ہمالہ کی چٹانوں کا
اُٹھو رُخ پھیر دو دُشمن کی توپوں کے دہانوں کا
وطن کی سرحدوں پر آہنی دیوار ہو جاؤ

وہ جن کو سادگی میں ہم نے آنکھوں پر بٹھایا تھا
وہ جن کو بھائی کہہ کر ہم نے سینے سے لگایا تھا
وہ جن کی گردنوں میں ہار باہوں کا پہنایا تھا
اب اُن کی گردنوں کے واسطے تلوار ہو جاؤ

نہ ہم اس وقت ہندو ہیں، نہ مسلم ہیں، نہ عیسائی
اگر کچھ ہیں تو ہیں اِس دیش، اِس دھرتی کے شیدائی
اِسی کو زندگی دیں گے، اسی سے زندگی پائی
لہو کے رنگ سے لکھا ہوا اقرار ہو جاؤ

خبر رکھنا، کوئی غدّار سازش کر نہیں پائے
نظر رکھنا، کوئی ظالم تجوری بھر نہیں پائے
ہماری قوم پر تاریخ تہمت دھر نہیں پائے
وطن دشمن درندوں کے لئے للکار ہو جاؤ
وطن کی آبرو خطرے میں ہے ہُشیار ہو جاؤ

نوحہ

اَن کہی داستاں اَن کہی رہ گئی
دل کے جذبات کا رازداں چل دیا
منزلیں لُٹ گئیں، راستے کھو گئے
گردِ غم رہ گئی، کارواں چل دیا
اَن کہی داستاں اَن کہی رہ گئی

نفرتوں کا دھواں اتنا گہرا ہوا
سانس انسانیت کی اُلجھنے لگی
لوگ اِس درجہ نامہرباں ہوگئے
ہو کے مایوس اک مہرباں چل دیا
اَن کہی داستاں اَن کہی رہ گئی

جس نے تنکے چنے آشیاں کے لئے
آج اُسے آشیاں سے نکلنا پڑا
جس کے خوں سے نکھار آگیا گلستاں
آج وہ چھوڑ کے گلستاں چل دیا
اَن کہی داستاں اَن ہی کہی رہ گئی

اُس کو ٹوکے تو کس منہ سے ٹوکے کوئی
شرم آتی ہے کیا راہ روکے کوئی
جس میں سب کے پنپنے کا امکان تھا
رُوٹھ کر ملک سے وہ سماں چل دیا
اَن کہی داستاں اَن ہی کہی رہ گئی
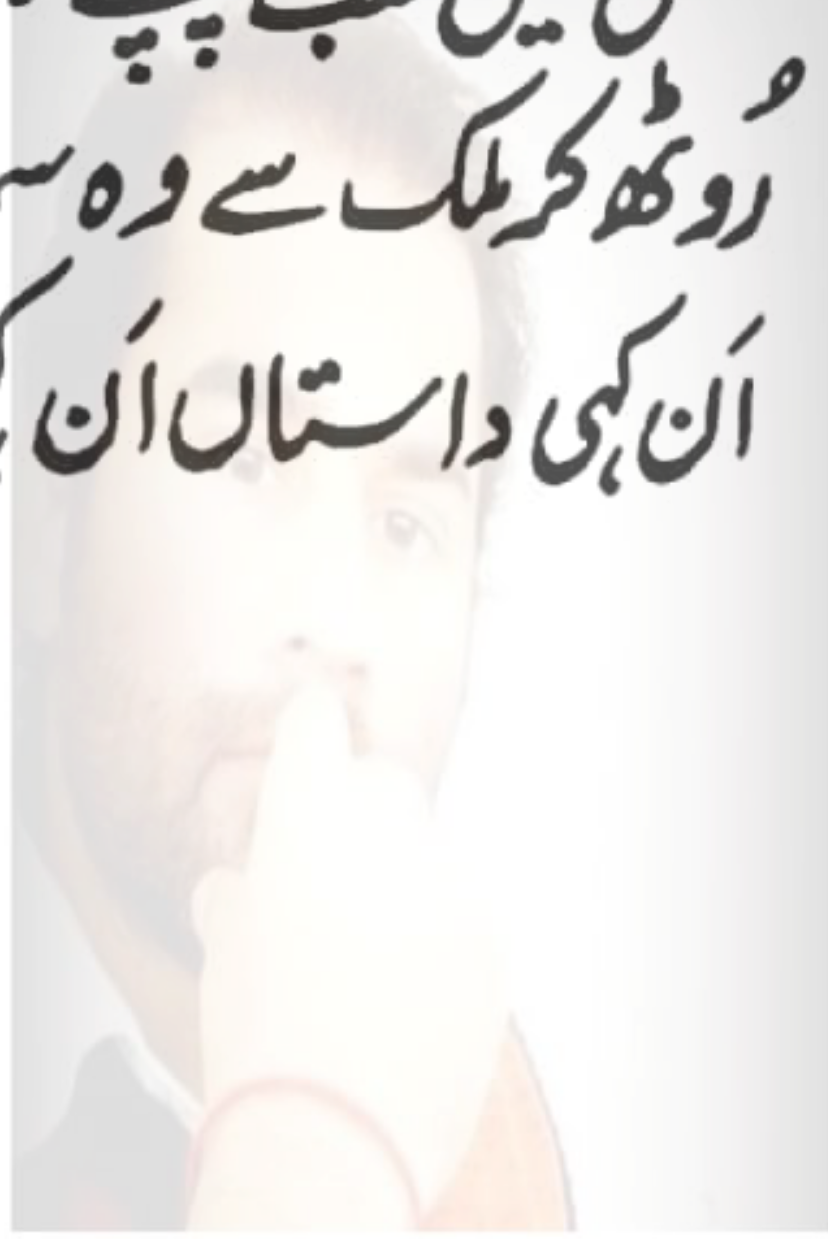
ماں

میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں

میری گود میں پنپ رہا ہے
دھرم کا اور ایمان کا سنگم

میرا چھوٹا سا آنچل ہے
گیتا اور قرآن کا سنگم
میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں

دو تہذیبوں کی دھارائیں
اک سانچے میں ڈھلتے دیکھوں
اکبر اور اشوک کا سپنا

گھر آنگن میں ہلتے دیکھوں
میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں
صدیاں جس وردان کو ترسیں
مجھ کو وہ وردان مِلا ہے
پیار کی اِک ڈوری میں لپٹا
کل کا ہندوستان مِلا ہے
میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں
سینے پر زخموں کے تمغے
لب پر آزادی کے نعرے
اس سج دھج سے میرے بیٹے
آج آئیں ہیں ماں کے دوارے
میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں
میری گود کے پالوں پر
کل سارا بھارت مان کرے گا
مجھ سی ماں کہلانے کو
ہر ماں کا دِل ارمان کرے گا

میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں

ایک بیٹے کی لاش اِدھر ہے

اِک بیٹے کی لاش اُدھر ہے

اِس کا خون اُس کے سر پہ ہے

اُس کا خون اِس کے سر پہ ہے

پہلے کس پہ پھول چڑھاؤں

پہلے کس کو کفن اُڑھاؤں

موت کے بیوپاری نیتاؤ

میں دیوانی سمجھ نہ پاؤں

میں کتنی خوش قسمت ماں ہوں

گیت

کیا ملیئے ایسے لوگوں سے جن کی فطرت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے، اصلی صورت چھپی رہے

خود سے ہی خود کو چھپائے کیا اُس سے پہچان کریں
کیا اُس کے دامن سے لپٹیں کیا اُس کا ارمان کریں
جس کی آدھی نیت اُبھرے آدھی نیت چھپی رہے
نقلی چہرہ ۔۔۔۔۔۔

دلداری کا ڈھونگ رچا کر جال بچھائے باتوں کا!
جیتے جی کا رشتہ کہہ کر سکھ ڈھونڈے کچھ راتوں کا
روح کی حسرت لب پر آئے جسم کی حسرت چھپی رہے
نقلی چہرہ ۔۔۔۔۔

راہبر کیسے کیسے

مہرباں کیسے کیسے، قدرداں کیسے کیسے
آج محفل میں آئے ہوئے ہیں

رِند بھی ان میں ہیں پارسا بھی
کشتیِ قوم کے ناخُدا بھی
معتبر کیسے کیسے، راہبر کیسے کیسے
آج مسند سجائے ہوئے ہیں

قوم کی خدمت کام ہے ان کا
اس خدمت سے نام ہے ان کا

بھوکوں کے غم میں گھلتے ہیں
سونے چاندی میں تلتے ہیں
دوران کی بلائیں، ان پہ قربان جائیں
یہ جو نظریں جھکائے ہوئے ہیں

ساز اور ساز کے نغمے کیا ہیں
حسن اور حسن کے جلوے کیا ہیں
شرم ہے کیا اور غیرت کیا ہے؟
عزت کیا ہے عصمت کیا ہے؟
یہ ہوس کے پرندے، نیک صورت درندے
دام سب پہ لگائے ہوئے ہیں

یہ یتیموں کا حق کھانے والے
بے بسوں پہ ستم ڈھانے والے
بس چلے تو وطن بیچ ڈالیں
یہ مندروں کے صنم تک نہ چھوڑیں
یہ جو بدکاریوں سے، چور بازاریوں سے
شان و شوکت بڑھائے ہوئے ہیں

کس کے لئے

سُرخ جوڑے کی یہ جگمگاہٹ
شوخ بندیا کی یہ جھلملاہٹ
چُوڑیوں کا یہ رنگیں ترانہ
دھڑکنوں کا یہ سپنا سُہانا

جاگا جاگا سا گجرے کا جادو
بھینی بھینی سی گجرے کی خوشبو
نرم ہونٹوں کا یہ کپکپانا
گرم چہرے کا یہ تمتمانا

جسم کا یہ مہکا مہکا پسینہ
حُسن کا یہ دہکا دہکا نگینہ
جھانجھنوں کا یہ تھم تھم کے بجنا
یہ سنورنا۔ نکھرنا۔ یہ سجنا

کِس کی خاطر ہے، کس کے لئے ہے

ہم سر بکف اُٹھے ہیں

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظُلم کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

ظالم کو جو نہ روکے وہ شامل ہے ظُلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے وہ قاتل کے ساتھ ہے
ہم سر بکف اُٹھے ہیں کہ حق فتح یاب ہو
کہہ دو اُسے جو لشکرِ باطل کے ساتھ ہے

اِس ڈھنگ پر ہے زور، تو یہ ڈھنگ ہی سہی
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

ظالم کی کوئی ذات، نہ مذہب، نہ کوئی قوم
ظالم کے لب پہ ذکر بھی اِن کا گناہ ہے

پھلتی نہیں ہے شاخِ ستم اِس زمین میں
تاریخ جانتی ہے، زمانہ گواہ ہے

کچھ کور باطنوں کی نظر تنگ ہی سہی
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

یہ زر کی جنگ ہے نہ زمینوں کی جنگ ہے
یہ جنگ ہے بقا کے اصولوں کے واسطے
جو خون ہم نے نذر دیا ہے زمین کو
وہ خون ہے گلاب کے پھولوں کے واسطے

پھوٹے گی صبحِ امن، لہو رنگ ہی سہی
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

★

آج اِس درجہ پلادو کہ نہ کچھ یاد رہے
بے خودی اتنی بڑھادو کہ نہ کچھ یاد رہے

دوستی کیا ہے، وفا کیا ہے، محبّت کیا ہے؟
دِل کا کیا مول ہے، احساس کی قیمت کیا ہے؟
ہم نے سب جان لیا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟
آج اِس درجہ . . . . .

مفلسی دیکھی، امیری کی ادا دیکھ چکے
غم کا ماحول، مسرت کی فضا دیکھ چکے
کیسے پھرتی ہے زمانے کی ہَوا دیکھ چکے
شمع یادوں کی بُجھادو کہ نہ کچھ یاد رہے۔ آج اِس درجہ . . .

عشق بے چین خیالوں کے سوا کچھ بھی نہیں
حسن بے روح اجالوں کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی چند سوالوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ہر سوال ایسے مٹا دو کہ نہ کچھ یاد رہے۔ آج اس درجہ...
مٹ نہ پائے گا جہاں سے کبھی نفرت کا رواج
ہو نہ پائے گا کبھی روح کے زخموں کا علاج
سلطنت ظلم، خدا وہم، مصیبت ہے سماج
ذہن کو ایسے سلا دو کہ نہ کچھ یاد رہے
آج اس درجہ پلا دو کہ نہ کچھ یاد رہے
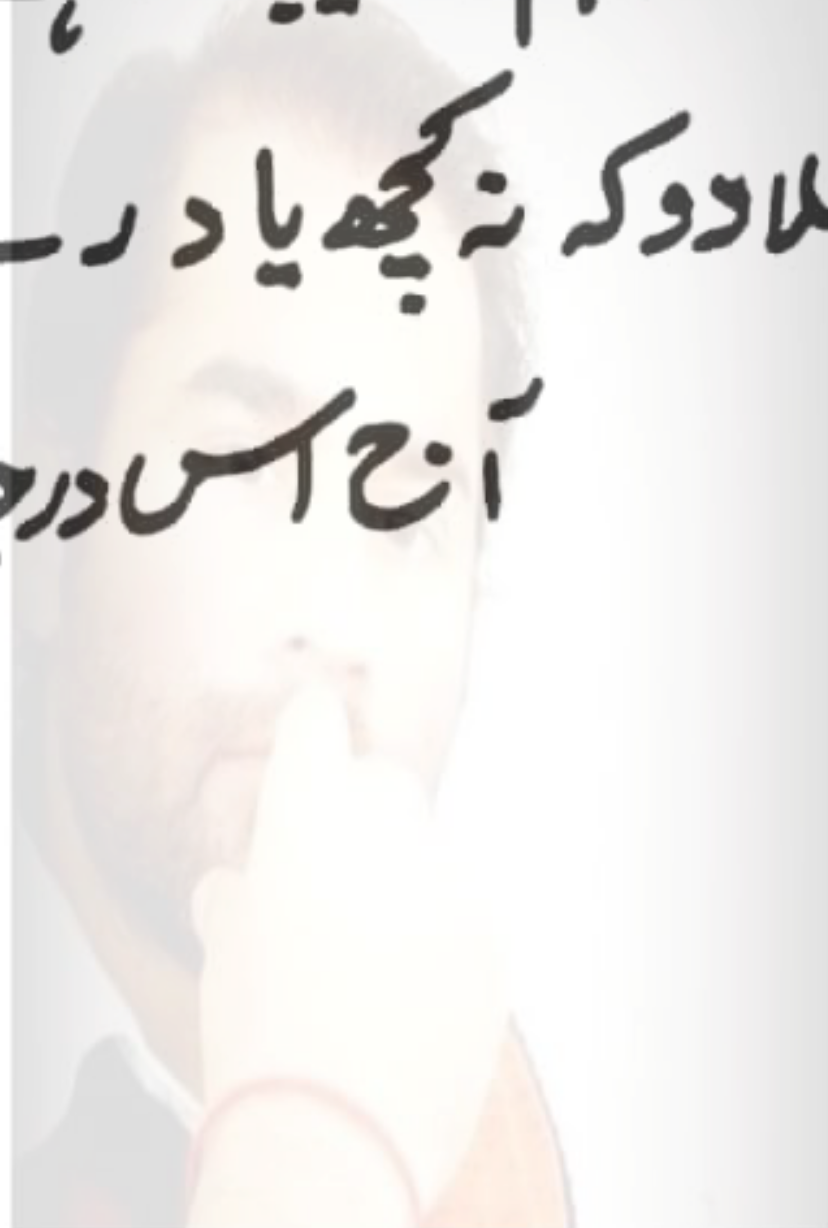
دِل کی داستاں

یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں
سُن جا دِل کی داستاں

پیڑوں کی شاخوں پہ سوئی سوئی چاندنی
تیرے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی
اور تھوڑی دیر میں تھک کے لوٹ جائے گی
رات یہ بہار کی پھر کبھی نہ آئے گی
دو چار پل اور ہے یہ سماں
سُن جا دل کی داستاں

لہروں کے ہونٹوں پہ دھیما دھیما راگ ہے

بھیگی ہواؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ ہے
اِس حسین آگ میں تُو بھی جل کے دیکھ لے
زندگی کے گیت کی دُھن بدل کے دیکھ لے
کُھلنے نہ دے دھڑکنوں کی زباں
سُن جا دِل کی داستاں

جاتی بہاریں ہیں اُٹھتی جوانیاں
تاروں کی چھاؤں میں کہہ لے کہانیاں
ایک بار چل دیئے گر تجھے پُکار کے
لوٹ کے نہ آئیں گے قافلے بہار کے
آجا ابھی زندگی ہے جواں
سُن جا دِل کی داستاں

گیت

پھولوں کے بسنتی گہنے
دھرتی کی دلہن نے پہنے
نظاروں پہ نکھار آ گیا
میرے مترا

متوالے دلوں کی ٹولی
جب بولی پیار کی بولی
نگاہوں میں سرور آ گیا
میرے مترا

یہ دیش حسین گلشن ہے
ہر آنکھ میں اپنا پن ہے

جُدائی والی بات کوئی نا

سب مذہب اور قبیلے

ہیں ایک ہوئے اس حیلے

کہ موسموں کی بات کوئی نا

میرے مترا

ہو ہو

اس میں پہ سب کچھ واری

رہے سدا یہ سلجھے داری

ہو یاروں میں تمیز کوئی نا

میرے مِترا

دل ملنے کے ہیں سب میلے

جس مول ملے دِل لے لے

کہ دِل جیسی چیز کوئی نا

میرے مترا۔ ہو

پیار کرلیا تو کیا

پیار کرلیا تو کیا پیار ہے خطا نہیں
تیری میری عمر میں کس نے یہ کیا نہیں

تیرے ہونٹ میرے ہونٹ مل گئے تو کیا ہوا
دل کی طرح جسم بھی مل گئے تو کیا ہوا
اِس سے پہلے کیا کبھی یہ ستم ہوا نہیں
پیار کرلیا تو کیا پیار ہے خطا نہیں

میں بھی ہوشمند ہوں تو بھی ہوشمند ہے
اُس طرح جیئیں گے ہم جس طرح پسند ہے
اُن کی بات کیوں سُنیں جن سے واسطہ نہیں
پیار کرلیا تو کیا پیار ہے خطا نہیں

رسم کیا رواج کیا، دھرم کیا، سماج کیا
دشمنوں کا خوف کیوں، دوستوں کی لاج کیا
یہ وہ شوق ہے کہ جس سے کوئی بھی بچا نہیں
پیار کرلیا تو کیا پیار ہے خطا نہیں

انتظار

ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تُو آئے

یہ انتظار بھی اِک امتحان ہوتا ہے
اِسی سے عشق کا شعلہ جوان ہوتا ہے
یہ انتظار سلامت ہو اور تو آئے

بچھائے شوق کے سجدے وفا کی راہوں میں
کھڑے ہیں دید کی حسرت لئے نگاہوں میں
قبول دل کی عبادت ہو اور تُو آئے

وہ خوش نصیب ہے جس کو تُو انتخاب کرے
خدا ہماری محبّت کو کامیاب کرے
جواں ستارۂ قسمت ہو اور تو آئے
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

گیت

محبّت کا تعلّق شان و شوکت سے نہیں ہوتا
یہ سودا ایسا سودا ہے جو دولت سے نہیں ہوتا

کچھ لوگ محبت کو بیوپار سمجھتے ہیں
دنیا کو کھِلونوں کا بازار سمجھتے ہیں

دولت کا نشہ اُن کو کچھ اتنا زیادہ ہے
دنیا کی ہر اک شئے کو پانے کا اِرادہ ہے

اپنے کو دو عالم کا مختار سمجھتے ہیں
کچھ لوگ محبت ....

دل کیا ہے ؟ وفا کیا ہے ؟ یہ لوگ نہ سمجھیں گے
مٹنے کی ادا کیا ہے ؟ یہ لوگ نہ سمجھیں گے

ہر شخص کو بِکنے پر تیّار سمجھتے ہیں
کچھ لوگ ....

کہیئے بھی تو اِن جیسے دلداروں کو کیا کہیئے
مجبور ہیں عادت سے بیچاروں کو کیا کہیئے

ہم ایسے دماغوں کو بیمار سمجھتے ہیں
کچھ لوگ محبّت کو بیوپار سمجھتے ہیں
دنیا کو کِھلونوں کا بازار سمجھتے ہیں

غزل

یہ آنکھیں دیکھ کر ہم ساری دنیا بھول جاتے ہیں
اُنہیں پانے کی دُھن میں ہر تمنا بھول جاتے ہیں

تم اپنی مہکی مہکی زلف کے پیچوں کو کم کر دو
مسافر اِن میں گِھر کر اپنا رستہ بھول جاتے ہیں

یہ باہیں جب ہمیں اپنی پناہوں میں بُلاتی ہیں
ہمیں اپنی قسم ہم ہر سہارا بھول جاتے ہیں

تمہارے نرم و نازک ہونٹ جِس دم مسکراتے ہیں
بہاریں دیکھتی ہیں، پھُول کھِلنا بھُول جاتے ہیں

جو ہم میں ہے وہ متوالی ادا سب میں نہیں ہوتی
محبت سب میں ہوتی ہے وفا سب میں نہیں ہوتی

ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے
بچ کے رہنا مری جاں یہ زمانہ بُرا ہے

زلف لہرائے تو زنجیر بھی بن جاتی ہے
آنکھ شرمائے تو اک تیر بھی بن جاتی ہے
دل لبھانے کو جو دلدار بنا کرتے ہیں
دل چُرا کر وہی تلوار بنا کرتے ہیں
یہ وہ محفل ہے جہاں پیار بھی لُٹ جاتا ہے
دل تو کیا چیز ہے گھر بار بھی لُٹ جاتا ہے

اِسی لئے تو کہتی ہوں۔
ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے
تک کے ہنستے ہیں تو مستانہ بنا دیتے ہیں
اور ہنس کے تکتے ہیں تو دیوانہ بنا دیتے ہیں
کوئی نغموں میں کوئی ساز میں کھو جاتا ہے
ان سے جو بچتا ہے وہ ناز میں کھو جاتا ہے
یوں تو گر ان سے لپٹ جاتی ہیں باہیں انکی
اِسی لئے تو کہتی ہوں۔
ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے

ہم ستم ڈھاتے ہیں بیداد کیا کرتے ہیں
دل لیا کرتے ہیں اور درد دیا کرتے ہیں
دُور رہنا ہو تو محفل مری آباد کرو
ورنہ جاؤ جی کسی اور کو برباد کرو

آج جاؤ گے تو کل لوٹ کے پھر آؤ گے
ہم سا معشوق نہ دنیا میں کہیں پاؤ گے
اسی لئے تو کہتی ہوں۔
ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے

جیو تو ایسے جیو جیسے سب تمہارا ہے
مرو تو ایسے کہ جیسے تمہارا کچھ بھی نہیں

یہ ایک راز کہ دنیا نہ جس کو جان سکی
یہی وہ راز ہے جو زندگی کا حاصل ہے
تمہیں کہو تمہیں یہ بات کیسے سمجھاؤں
کہ زندگی کی گھٹن زندگی کی قاتل ہے
ہر اک نگاہ کو قدرت کا یہ اشارہ ہے

جہاں میں آ کے جہاں سے کھنچے کھنچے نہ رہو
وہ زندگی ہی نہیں جس میں آس بجھ جائے

کوئی بھی پیاس دبائے سے دب نہیں سکتی
اِسی سے چین ملے گا کہ پیاس بجھ جائے
یہ کہہ کے مُڑتا ہوا زندگی کا دھارا ہے

یہ آسماں، یہ زمیں، یہ فضا، یہ نظّارے
ترس رہے ہیں تمہاری مری نظر کے لیے
نظر چُرا کے ہر اک شے کو یوں نہ ٹھکراؤ
کوئی شریکِ سفر ڈھونڈ لو سفر کے لئے
بہت قریب سے میں نے تمہیں پکارا ہے

بے تعلق سی ملاقات

ہم میں ہے کیا کہ ہمیں کوئی حسینہ چاہے
صرف جذبات ہیں جذبات میں کیا رکھا ہے

کس کی تقدیر میں ہیں اس کے مہکتے گیسو
کس کے گھر کھیلے گا اس مست نظر کا جادو
ان پریشاں سوالات میں کیا رکھا ہے
صرف جذبات ۔ ۔ ۔

اتنا دیوانہ نہ بن اے دلِ بے تاب سنبھل
وہ اگر مل بھی گئے تجھ سے تو اتنا نہ مچل
بے تعلق سی ملاقات میں کیا رکھا ہے
صرف جذبات ۔ ۔ ۔

مسکراہٹ کو محبت کا اشارہ نہ سمجھ

مل گئے ہوں گے وہ یوں ہی انہیں اپنا نہ سمجھ
ایسے نادان سوالات میں کیا رکھا ہے
صرف جذبات ۔ ۔ ۔

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتا یاد آیا

آپ کے لب پہ کبھی اپنا بھی نام آیا تھا
شوخ نظروں سے محبت کا سلام آیا تھا
عمر بھر ساتھ نبھانے کا پیام آیا تھا
آپ کو دیکھ کے وہ عہدِ وفا یاد آیا

روح میں جل اُٹھے بجھتی ہوئی یادوں کے دیئے
کیسے دیوانے تھے ہم آپ کو پانے کے لئے

یوں تو کچھ کم نہیں جو آپ نے احسان کئے
پر جو مانگے سے نہ پایا وہ صلہ یاد آیا

آج وہ بات نہیں پھر بھی کوئی بات تو ہے
میرے حصے میں یہ ہلکی سی ملاقات تو ہے
غیر کا ہو کے بھی یہ حسن مرے ساتھ تو ہے
ہائے کس وقت مجھے کب کا گلہ یاد آیا
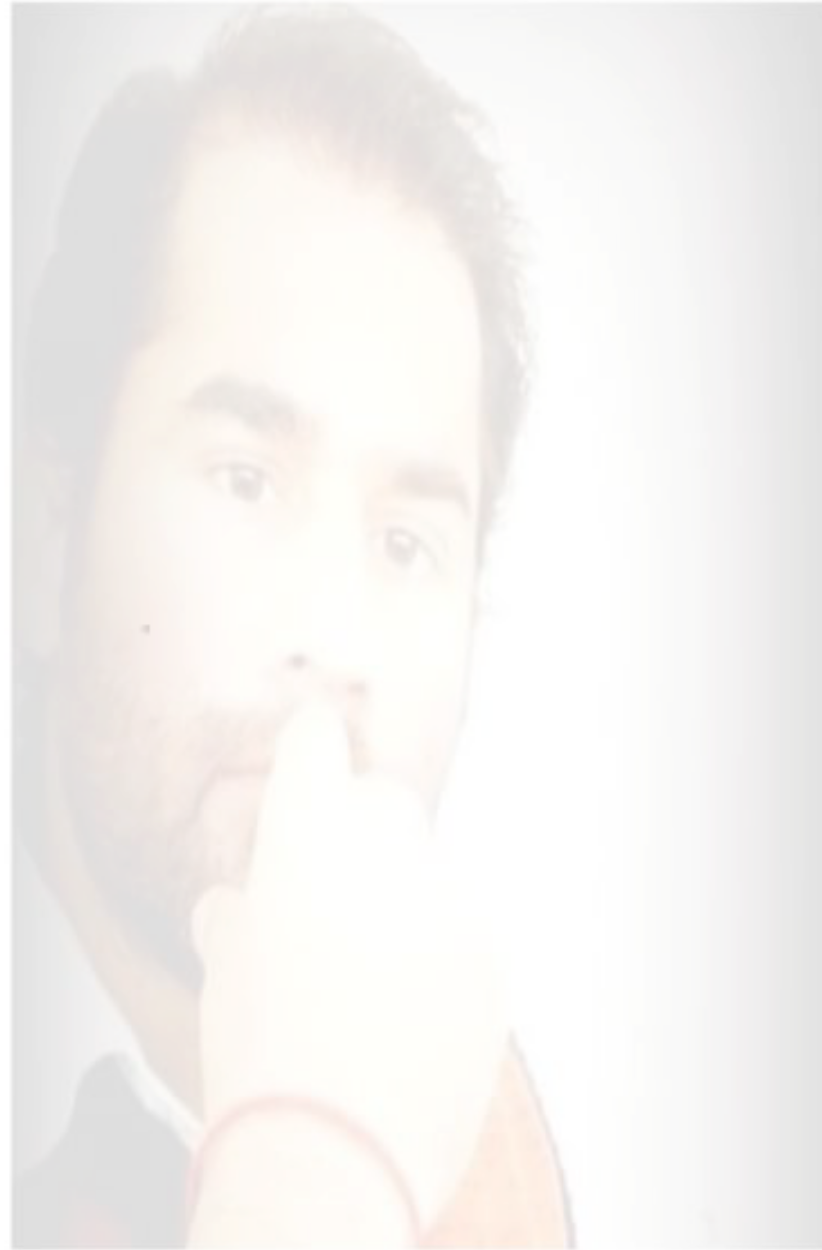
کرشن پھر آئیں گے

آج اس نظم کو پڑھ کر بڑا عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ جناب ساحر لدھیانوی نے یہ جذباتی تحفہ کرشن چندر کو ان کے جشن کے موقع پر نذر کیا تھا۔ آج جبکہ کرشن جا چکے ہیں۔ ساحر کی یہ نظم "کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے" بڑا درد بھرا احساس چھوڑتی ہے۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کرشن گئے نہیں۔ وہ اپنے ادب کے قیمتی خزانے میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے
جب بھی دھرتی پر گناہوں کا اندھیرا چھایا
جب بھی ظلم اور شقاوت کا علم لہرایا
کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے

اور جب ایسے ہی حالات نے پنجے گاڑے
ظلم نے سولیاں وحشت نے شکنجے گاڑے

اور بھارت پہ کڑا وقت پڑا

کرشن پھر آئے غلاموں کا لہو گرمانے

کرشن پھر آئے مگر اب کی بار

بانسری کی جگہ ہاتھوں میں قلم تھا اُن کے

یہ قلم رسم و روایات کے آگے نہ جھکا

زنگ آلود خیالات کے آگے نہ جھکا

ظلم کے جبر کے آفات کے آگے نہ جھکا

صبح کا نور تھا یہ رات کے آگے نہ جھکا

اور جب ظلم کے بندھن ٹوٹے

قید افرنگ سے قیدی چھوٹے

یہ قلم اور بھی بے باک ہوا

اب اسے اپنا نہیں سارے جہاں کا غم تھا

سارے مظلوموں کا یہ ہمدم و دم ساز بنا

اس کی آواز کو کانگو کی فضا جانتی ہے

الجزائر کے شہیدوں کی قبا جانتی ہے

کوریا کے دلِ صد چاک کو ہے اس کی خبر

ہیروشیما کی سم آلود ہوا جانتی ہے
ویت نام آج بھی سنتا ہے صدائیں اس کی
مصر کی ارض حسین اس کی وفا جانتی ہے
اپنے حق کے لئے لڑتی ہوئی ساری مخلوق
اس کی آواز کو پیغام بقا جانتی ہے

کرشن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر آئیں گے

کرشن پھر آئے ۔۔۔

مگر اب کی بار ہم انہیں دیر میں پہچان سکے
سارے سنسار نے جب جان لیا تب کہیں جان سکے

ہم بہت دیر میں یہ مان سکے
کرشن ایک ذات نہیں ایک عمل ہوتا ہے
کرشن ایک سلسلۂ جہد بقا ہے یعنی

آج ہوتا ہے کوئی اس کا نہ کل ہوتا ہے

کرشن ہر دور میں آتا ہے نیا روپ لئے
کرشن ہر دور کے ارمانوں کا پھل ہوتا ہے

آزاد وطن کو دیکھ ذرا

لے میرے بدن کو دیکھ ذرا

اندر سے ایسی ہوتی ہے　　بیٹی کو بہن کو دیکھ ذرا
خوشحال ہے تو، زردار ہے تو　　مجبور ہوں میں مختار ہے تو
عزت ہو کہ محنت مفلس کی　　ہر نعمت کا حقدار ہے تو
جلووں کی پھبن کو دیکھ ذرا

جنگل میں یہی کچھ ہوتا ہے　　جنگل ہی کی اولاد ہے تو
تہذیب ہے کیا، اخلاق ہے کیا　　ان چیزوں سے آزاد ہے تو
عزت کے کفن کو دیکھ ذرا

قانون ملازم ہے تیرا　　اسی جرم کو اک تفریح سمجھ
جس نسل پہ تیرا سایہ ہے　　اس کے کل کی تشریح سمجھ

وحشت کے چلن کو دیکھ ذرا

کپڑے ہی نہیں، روٹی کے لئے — یاں کھال بھی نوچی جاتی ہے

بیٹی ہو، بہن ہو یا ماں ہو — ہر لاش دبوچی جاتی ہے

آزاد وطن کو دیکھ ذرا

الوداع

لو اپنا جہاں دُنیا والو
ہم اِس دنیا کو چھوڑ چلے
جو رشتے ناتے جوڑے تھے
وہ رشتے ناتے توڑ چلے

کچھ سُکھ کے سپنے دیکھ چلے
کچھ دُکھ کے صدمے جھیل چلے
تقدیر کی اندھی گردش نے
جو کھیل کھلائے کھیل چلے

ہر چیز تمہیں لوٹا دی ہے
ہم لے کے نہیں کچھ ساتھ چلے
پھر دوش نہ دینا اے لوگو
ہمیں دیکھ لو خالی ہاتھ چلے

یہ راہ اکیلی کٹتی چلے
یہاں ساتھ نہ کوئی یار چلے
اُس پار نہ جانے کیا پائیں
اِس پار تو سب کچھ ہار چلے

بس اِتنا ہی فسانہ ہے

سنسار کی ہر شے کا اتنا ہی فسانہ ہے !
اک دھند سے آنا ہے اک دھند میں جانا ہے

یہ راہ کہاں سے ہے، یہ راہ کہاں تک ہے
یہ راز کوئی راہی سمجھا ہے نہ جانا ہے

اک پل کی پلک پر ہے ٹھہری ہوئی یہ دنیا
اک پلک جھپکنے تک ہر کھیل سُہانا ہے

کیا جانے کوئی کس پر کس موڑ پر کیا بیتے
اس راہ میں اے راہی ہر موڑ بہانا ہے

ہم لوگ کھلونا ہیں اک ایسے کھلاڑی کا
جس کو ابھی صدیوں تک یہ کھیل رچانا ہے

آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو

آپ کیا جانیں مجھ کو سمجھتے ہیں کیا
میں تو کچھ بھی نہیں

اس قدر پیار، اتنی بڑی بھیڑ کا۔ میں رکھوں گا کہیں ؟

اس قدر پیار رکھنے کے قابل نہیں ۔ میرا دِل میری جان

مجھ کو اتنی محبّت نہ دو دوستو

پیار اک شخص کا بھی اگر مل سکے

تو بڑی چیز ہے زندگی کے لئے

آدمی کو مگر یہ بھی ملتا نہیں ۔ یہ بھی ملتا نہیں

مجھ کو اتنی محبّت مِلی آپ سے

یہ میرا حق نہیں، میری تقدیر ہے

میں زمانے کی نظروں میں کچھ بھی نہ تھا
میری آنکھوں میں اب تک وہ تصویر ہے
اس محبّت کے بدلے میں کیا نذر کروں
مَیں تو کچھ بھی نہیں

عزتیں، شہرتیں، چاہتیں، اُلفتیں
کوئی بھی چیز دُنیا میں رہتی نہیں
آج مَیں ہوں جہاں کل کوئی اور تھا
یہ بھی اِک دَور ہے وہ بھی اِک دَور تھا

آج اتنی محبّت نہ دو دوستو
کہ میرے کل کے لئے
کل جو گمنام ہے، کل جو سنسان ہے
کل جو انجان ہے، کل جو ویران ہے
مَیں تو کچھ بھی نہیں، مَیں تو کچھ بھی نہیں،

نظارے ہم کیا دیکھیں

تیرے چہرے سے نظر نہیں ہٹتی نظارے ہم کیا دیکھیں
تجھے مل کے بھی پیاس نہیں گھٹتی نظارے ہم کیا دیکھیں

پگھلے بدن تیری تپتی نگاہوں سے
شعلوں کی آنچ آئے برفیلی راہوں سے
لگے قدموں سے آگ لپٹتی، نظارے ہم دیکھیں

رنگوں کی برکھا ہے، خوشبو کا ساتھ ہے
کس کو پتہ ہے اب دن ہے کہ رات ہے
لگے دنیا ہی آج سمٹتی، نظارے ہم کیا دیکھیں

پلکوں پہ پھیلا تیری پلکوں کا سایا ہے
چہرے نے تیرے میرا چہرہ چھپایا ہے
تیرے جلوؤں کی دھند نہیں چھٹتی، نظارے ہم کیا دیکھیں

بِھیگی بِھیگی رات

رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی
چاند بھی ہے کچھ مدّھم مدّھم
تم آؤ تو آنکھیں کھولے
سوئی ہوئی پایل کی چھم چھم
کس کو بتائیں کیسے بتائیں
آج عجب ہے دل کا عالم
چین بھی ہے کچھ ہلکا ہلکا
درد بھی ہے کچھ مدّھم مدّھم
تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم

جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے رُک رُک تھم تھم
ہوش میں تھوڑی بیہوشی ہے
بیہوشی میں ہوش ہے کم کم
تجھ کو پانے کی کوشش میں
دونوں جہاں سے کھوئے گئے ہم

انصاف کا ترازو

انصاف کا ترازو جو ہاتھ میں اُٹھائے
جُرموں کو ٹھیک تولے!
ایسا نہ ہو کہ کل کا اتہاس کار بولے
مجُرم سے بھی زیادہ
مُنصف نے ظُلم ڈھایا
کیس پیش اُس کے آگے غم کی گواہیاں بھی
رکھیں نظر کے آگے دل کی تباہیاں بھی
اُس کو یقیں نہ آیا
انصاف کر نہ پایا
اور اپنے اِس عمل سے
بدکار مجرموں کے ناپاک حوصلوں کو

کچھ اور بھی بڑھایا

اِنصاف کا ترازو جو ہاتھ میں اُٹھائے
یہ بات یاد رکھے
سب مُنصفوں سے اُوپر
اِک اور بھی ہے مُنصف
وہ دو جہاں کا مالک
سَب حال جانتا ہے
نیکی کے اور بدی کے
احوال جانتا ہے
دنیا کے فیصلوں سے
مایوس جانے والا
ایسا نہ ہو کہ اُس کے دربار میں پُکارے
ایسا نہ ہو کہ اُس کے انصاف کا ترازو
اک بار پھر سے تولے
مجرم کے ظلم کو بھی
مُنصف کی بھُول کو بھی

اور اپنا فیصلہ دے
وہ فیصلہ کہ جس سے
یہ رُوح کانپ اُٹھے!

جنگل کے لوگ

دیواروں کا جنگل جس کا آبادی ہے نام
باہر سے چُپ چُپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
دیواروں کے اِس جنگل میں بھٹک رہے انسان
اپنے اپنے اُلجھے دامن جھٹک رہے انسان

اپنی بستی چھوڑ کے آئے کون کسی کے کام
باہر سے چُپ چُپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
سینے خالی، آنکھیں سُونی، چہرے پر حیرانی
جتنے گھنے ہنگامے اسمیں اتنی گھنی ویرانی

راتیں قاتل، صبحیں مجرم، ملزم ہے ہر شام
باہر سے چُپ چُپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
حال نہ پوچھیں، درد نہ بانٹیں اِس جنگل کے لوگ
اپنا اپنا سکھ ہے سب کا اپنا اپنا سوگ

کوئی نہیں جو ہاتھ بڑھا کر گرتوں کو لے تھام
باہر سے چپ چپ لگتا ہے اندر ہے کہُرام
بے بس کو دوشی ٹھہرائے اس جنگل کا نیائے
سچ کی لاش پہ کوئی نہ روئے جھوٹ کو سیس نوائے

پتھر کی ان دیواروں میں پتھر ہو گئے رام
باہر سے چپ چپ لگتا ہے اندر ہے کہرام

بستی بستی، پربت پربت
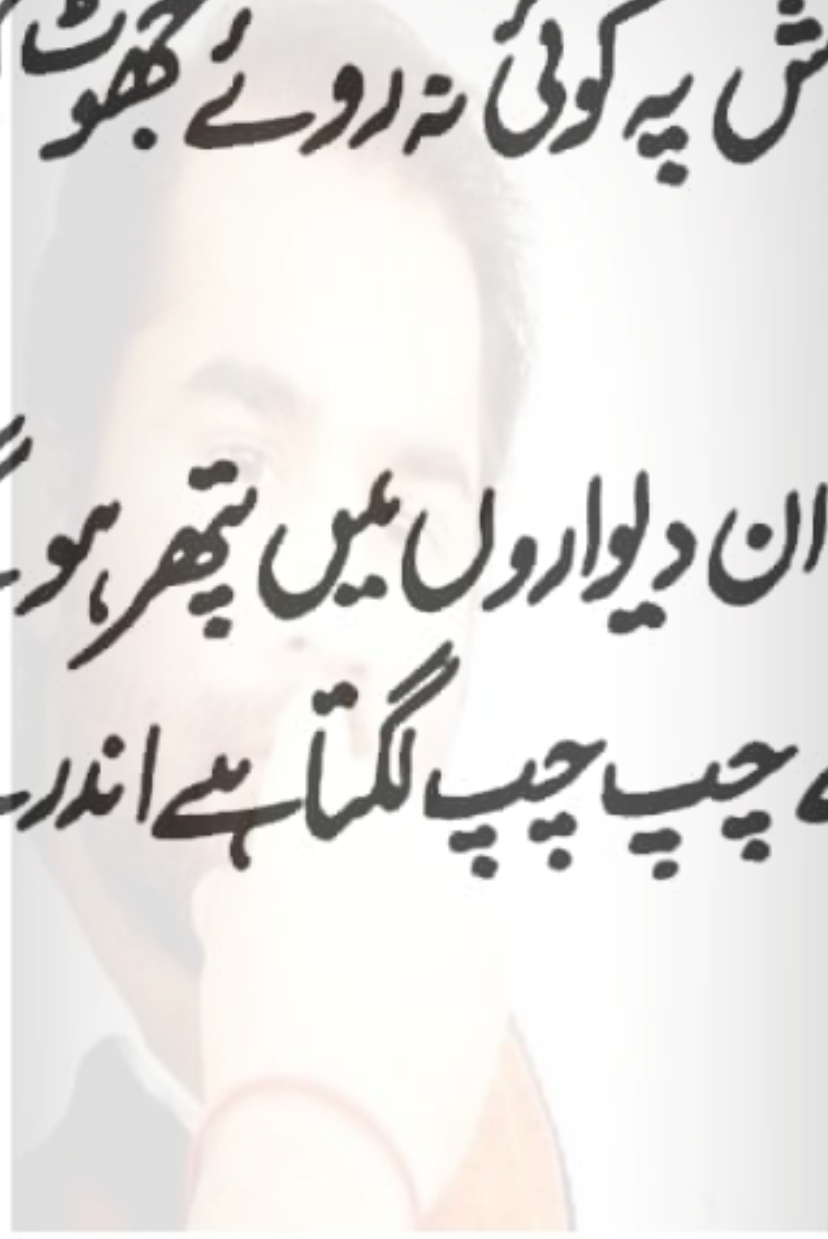
بستی بستی، پربت پربت گاتا جائے بنجارا
لے کر دل کا اک تارا

پل دو پل کا ساتھ ہمارا، پل دو پل کی یاری
آج رکے تو کل کرنی ہے چلنے کی تیاری

قدم قدم پر ہونی بیٹھی اپنا جال بچھائے
اس جیون کی راہ میں جانے کون کہاں رہ جائے

دھن دولت کے پیچھے کیوں ہے یہ دنیا دیوانی
یہاں کی دولت یہیں رہے گی ساتھ نہیں جانی

سونے چاندی میں تلتا ہو جہاں دلوں کا پیار
آنسو بھی بیکار وہاں پر آہیں بھی بیکار

دنیا کے بازار میں آخر چاہت بھی بیوپار بنی
میرے دل سے اُنکے دل تک چاندی کی دیوار بنی

ہم جیسوں کے بھاگ میں لکھا چاہت کا وردان نہیں
جس نے ہم کو جنم دیا وہ پتھر ہے بھگوان نہیں

بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارا

عورت

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں!
رُوح بھی ہوتی ہے اُنہیں یہ کہاں سوچتے ہیں

رُوح کیا ہوتی ہے اس سے انہیں مطلب ہی نہیں
وہ تو بس تن کے تقاضوں کا کہا مانتے ہیں
رُوح مر جائے تو یہ جسم ہے چلتی ہوئی لاش
اِس حقیقت کو سمجھتے ہیں نہ پہچانتے ہیں

کتنی صدیوں سے یہ وحشت کا چلن جاری ہے
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ گناہوں کا رواج

لوگ عورت کی ہر اک چیخ کو نغمہ سمجھے
وہ قبیلوں کا زمانہ ہو کہ شہروں کا رواج

جبر سے نسل بڑھے، ظُلم سے تن میل کریں
یہ عمل ہم میں ہے بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو اِنسانوں کی تہذیب لئے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

اِک بُجھی رُوح لُٹے جسم کے ڈھانچے میں لئے
سوچتی ہوں میں کہاں جا کے مقدّر پھوڑوں
میں نہ زندہ ہوں کہ مرنے کا سہارا ڈھونڈوں
اور نہ مُردہ ہوں کہ جینے کے غموں سے چھُوٹوں

کون بتلائے گا مجھ کو کسے جا کر پُوچھوں
زندگی قہر کے سانچے میں ڈھلے گی کب تک
کب تلک آنکھ نہ کھولے گا زمانے کا ضمیر
ظلم اور جبر کی یہ رِیت چلے گی کب تک

اب اگر ہم سے خدائی بھی خفا ہو جائے
غیر ممکن ہے کہ دل، دل سے جُدا ہو جائے

جس گھڑی مجھکو پُکاریں گی تمہاری باہیں
روک پائیں گی نہ صحرا کی سُلگتی راہیں
چاہے ہر سانس سُلگنے کی سزا ہو جائے
غیر ممکن ہے...
لاکھ زنجیروں میں جکڑیں یہ زمانے والے
توڑ کر بند نکل آئیں گے آنے والے
شرط اِتنی ہے کہ تو جلوہ نُما ہو جائے
غیر ممکن ہے...
زلزلے آئیں، گرجدار گھٹائیں گھیرے
خندقیں راہ میں ہوں، تیز ہوائیں گھیرے
چاہے دُنیا میں قیامت ہی بپا ہو جائے
غیر ممکن ہے...

تیری جوانی تپتا مہینہ، اے نازنینہ
چھو لے نظر تو آئے پسینہ، اے نازنینہ

ہائے یہ تیرا لہرا کے چلنا، اِٹھلا کے چلنا
رہ رہ کے دھڑکے دھرتی کا سینہ اے نازنینہ

تیرے بدن میں پھولوں کی نرمی، شعلوں کی گرمی
ہر انگ تیرا ترشا نگینہ اے نازنینہ

آنکھوں میں بجلی، زلفوں میں بادل، سانسوں میں ہلچل
تجھ سی نہیں کوئی قاتل حسینہ اے نازنینہ

جینے کا کوئی سامان کر دے، احسان کر دے
تیرے بغیر اب مشکل ہے جینا اے نازنینہ

ا :۔ اِس ریشمی پازیب کی جھنکار کے صدقے
جس نے یہ پہنائی ہے اُس دلدار کے صدقے

ب :۔ اس زلف کے قرباں لب و رخسار کے صدقے
ہر جلوہ تھا اک شعلہ حسنِ یار کے صدقے

ا :۔ جوانی مانگتی تھی یہ حسیں جھنکار برسوں سے
تمنّا بن رہی تھی دھڑکنوں کے ہار برسوں سے
چھُپ چھُپ کے آنے والے تیرے پیار کے صدقے
اِس ریشمی ...

ب :۔ جوانی سو رہی تھی حسن کی رنگیں پناہوں میں
چُرا لائے ہم اُن کے نازنیں جلوے نگاہوں میں
قسمت سے جو ہُوا ہے اُس دیدار کے صدقے
اس زُلف ...

ا :۔ نظر لہرا رہی ہے جسم پہ مستی سی چھائی ہے
دوبارہ دیکھنے کے شوق نے ہلچل مچائی ہے
دل کو جو لگ گیا ہے اُس آزار کے صدقے
اِس ریشمی ...

اب چاہے ماں روٹھے یا بابا، یارا میں نے تو ہاں کرلی
اب چاہے سر پھوٹے یا ماتھا، میں نے تیری باہ پکڑلی
میں نے تجھ سے نیت کرلی
میں نے ہنس کر ہامی بھرلی
یاری ٹوٹے نہ ....

تو ہے مدت سے دل میں سمائی
کب کہا میں نے میں ہوں پرائی
جب تجھے میں نے دیکھا تو بھائی
میں اسی وقت قدموں میں آئی
برف کے فرش پر
پیار کے عرش پر
چاندنی کے تلے، جب ملے تھے گلے
جسم لہرائے تھے، ہونٹ تھرائے تھے

تب یہ لی تھی قسم اب نہ بچھڑیں گے ہم
اب چاہے کانٹے ملیں یا کلیاں یارا میں نے تو ہاں کر لی
اب چاہے لگ جائیں ہتھکڑیاں میں نے تیری باہ پکڑ لی
اب چاہے ماں روٹھے یا بابا ....

لاکھ پہرے زمانہ بٹھلائے
لاکھ دیواریں دنیا اُٹھائے
اب قدم پیچھے ہٹنے نہ پائے
پیار پر کوئی تہمت نہ آئے
چاہے دھرتی پھٹے
چاہے اُمبر پھٹے
قول ٹوٹے نہ اب ساتھ چھوٹے نہ اب
جان جلائے تو کیا موت آئے تو کیا
پیار زندہ رہے یار زندہ رہے
اب چاہے گھر چھوٹے یا سکھیاں یارا میں نے تو ہاں کر لی
اب چاہے رب روٹھے یا دنیا میں نے تیری باہ پکڑ لی
اب چاہے ماں روٹھے یا بابا ....

ا :- یہ دل تم بن کہیں لگتا نہیں ہم کیا کریں
تصوّر میں کوئی بستا نہیں ہم کیا کریں
تمہیں کہہ دو اب اے جانِ وفا ہم کیا کریں

ب :- لُٹے دل میں دِیا جلتا نہیں، ہم کیا کریں
تمہیں کہہ دو اب اے جانِ ادا ہم کیا کریں

ا :- کِسی کے دل میں بس کے دل کو تڑپانا نہیں اچھا
نگاہوں کو جھلک دیدے کے چھُپ جانا نہیں اچھا
اُمیدوں کے کھِلے گلشن کو جُھلسانا نہیں اچھا
ہمیں تم بِن کوئی جچتا نہیں ہم کیا کریں

یہ دل تم بِن .....

ب :- محبّت کر تو لیں لیکن محبّت راس آئے بھی
دلوں کو بوجھ لگتے ہیں کبھی زلفوں کے سائے بھی
ہزاروں غم ہیں اِس دنیا میں اپنے بھی پرائے بھی
محبّت ہی کا غم تنہا نہیں ہم کیا کریں

لُٹے دل میں ....

ا :- بُجھا دو آگ دل کی یا اسے کھُل کر ہوا دے دو
جو اس کا مول دے پائے اُسے اپنی وفا دے دو
تمہارے دل میں کیا ہے بس ہمیں اتنا بتا دے دو
کہ اب تنہا سفر کٹتا نہیں ہم کیا کریں ... یہ دل تم بِن

بربادِ محبّت کی دُعا ساتھ لئے جا
ٹوٹا ہوا اقرارِ وفا ساتھ لئے جا

اک دل تھا جو پہلے ہی تجھے سونپ دیا تھا
یہ جان بھی اے جانِ ادا ساتھ لئے جا

تپتی ہوئی راہوں سے تجھے آنچ نہ پہنچے
دیوانے کے اشکوں کی گھٹا ساتھ لئے جا

شامل ہے مرا خُونِ جگر تیری حِنا میں
یہ کم ہو تو اب خونِ وفا ساتھ لئے جا

ہم جرمِ محبّت کی سزا پائیں گے تنہا
جو تجھ سے ہوئی ہو وہ خطا ساتھ لئے جا

تیرے در پہ آیا ہوں کچھ کر کے جاؤں گا
جھولی بھر کے جاؤں گا یا مر کے جاؤں گا

تُو سب کچھ جانے ہے ہر غم پہچانے ہے
جو دل کی اُلجھن ہے سب تجھ پر روشن ہے
گھائل پروانہ ہوں وحشی دیوانہ ہوں
تری شہرت سن سن کے اُمیدیں لایا ہوں
میں تیرے در پہ آیا ہوں...

دل غم سے حیراں ہے مری دنیا ویراں ہے
نظروں کی پیاس بجھا، مرا بچھڑا یار ملا
اب یا غم چھوٹے گا، ورنہ دم ٹوٹے گا
اب جینا مشکل ہے فریادیں لایا ہوں
میں تیرے در پہ آیا ہوں...

دل خوش ہے آج اُن سے ملاقات ہو گئی
گو دُور ہی سے بات ہوئی بات ہو گئی

اُن سے ہمارا کوئی تعلق تو بن گیا
بگڑے بھی وہ اگر تو بڑی بات ہو گئی

دھڑکن بڑھی تو سانس کی خوشبو بکھر گئی
آنچل اُڑا تو رنگ کی برسات ہو گئی

دل چاہتا ہے مان ہی لیں اب خدا کو ہم
جس کا یقیں نہ تھا وہ کرامات ہو گئی

زندگی ہنسنے گانے کے لئے ہے پل دو پل
اسے کھونا نہیں کھو کے رونا نہیں

تیرے گرنے میں بھی تیری ہار نہیں
کہ تو آدمی ہے، اوتار نہیں
جو ہو دیس وہ بھیس بنا پیارے
چلے جیسا بھی کام چلا پیارے
پیارے تو غم نہ کر
زندگی ہنسنے گانے کے لئے ہے ....

جہاں سچ نہ چلے وہاں جھوٹ سہی
جہاں حق نہ ملے وہاں لوٹ سہی

یہاں چور ہیں سب کوئی سادھو نہیں
سکھ ڈھونڈ لے سکھ، اپرادھ نہیں
پیارے تو غم نہ کر
زندگی ہنسنے گانے کے لئے ہے پل دو پل

مسیح پاک روح تھے

مسیح بے گناہ تھے
مگر اُنہیں بھی کیا ملا

یہی کہ اپنے واسطے صلیب خود اُٹھا کے لاؤ
اور اپنے قاتلوں کی خواہشِ ستم کے کام آؤ
جو ہم گناہ چھوڑ دیں، ہمیں مِلے گا کیا بتاؤ
کہ ہم مسیح بھی نہیں

بہشت میں نہ آدم اور حوّا ایک رہ سکے
فرشتے اُن کو اس زمیں پہ ڈال کر چلے گئے
ہماری زندگی ہے کیا؟ انہی کے جُرم کی سزا

گناہ اس کی ابتدا، گناہ اس کی انتہا
وہاں گناہ شوق تھا، یہاں گناہ بے بسی
کہ زندگی کے چار سانس کاٹنے کے واسطے
یہاں ہیں دو ہی راستے
ہے ایک راستہ گناہ، دوسرا ہے خودکشی
جو خود بھی اِک گناہ ہے

ہمارے اِردگرد جتنے لوگ ہیں وہ سب گناہ گار ہیں
وہ سب سیاہ کار ہیں
انہی کی نسل سے ہیں ہم خدا کی نسل سے نہیں
گناہ کر لیا تو کیا؟ کہ ہم مسیح بھی نہیں
مسیح پاک روح تھے
مسیح بے گناہ تھے

ہر طرف حُسن ہے جوانی ہے آج کی رات کیا سُہانی ہے
ریشمی جسم تھرتھراتے ہیں مرمریں خواب گنگناتے ہیں
دھڑکنوں میں سرور پھیلا ہے رنگ نزدیک دُور پھیلا ہے
دعوتِ عشق دے رہی ہے فضا آج ہو جا کسی حسیں پہ فدا

محبّت بڑے کام کی چیز ہے

محبّت کے دَم سے ہے دنیا کی رونق
محبّت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
نظر اور دل کی پناہوں کی خاطر
یہ جنّت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
یہی ایک آرام کی چیز ہے
محبت بڑے کام کی چیز ہے

کتابوں میں چھپتے ہیں چاہت کے قصّے
حقیقت کی دنیا میں چاہت نہیں ہے
زمانے کے بازار میں یہ وہ شئے ہے
کہ جس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے
یہ بے کار، بے دام کی چیز ہے

یہ بس نام ہی نام کی چیز ہے

محبّت بڑے کام کی چیز ہے

محبت سے اتنا خفا ہونے والے
چل آ آج تجھ کو محبت سکھا دیں
ترا دل جو برسوں سے ویراں پڑا ہے
کسی نازنینہ کو اس میں بسا دیں
مرا مشورہ بڑے کام کی چیز ہے
محبت بڑے کام کی چیز ہے

دل میں کسی کے پیار کا جلتا ہوا دیا
دنیا کی آندھیوں سے بھلا یہ بجھے گا کیا

سانسوں کی آنچ پا کے بھڑکتا رہے گا یہ
سینے میں دل کے ساتھ دھڑکتا رہے گا یہ
وہ نقش کیا ہوا جو مٹائے سے مٹ گیا
وہ درد کیا ہوا جو دبائے سے دب گیا
دل میں کسی کے پیار کا جلتا ہوا دِیا

یہ زندگی بھی کیا ہے امانت اُنہی کی ہے
یہ شاعری بھی کیا ہے عنایت اُنہی کی ہے
اب وہ کرم کریں کہ ستم ، اُن کا فیصلہ
ہم نے تو دل میں پیار کا شعلہ جگا لیا
دل میں کسی کے پیار کا جلتا ہوا دِیا

دُنیا کرے سوال تو ہم کیا جواب دیں
تم کو نہ ہو خیال تو ہم کیا جواب دیں

پوچھے کوئی کہ دل کو کہاں چھوڑ آئے ہیں
کس کس سے اپنا رشتۂ جاں توڑ آئے ہیں
مُشکل ہو عرضِ حال تو ہم کیا جواب دیں
دُنیا کرے سوال تو ہم کیا جواب دیں

پُوچھے کوئی کہ دردِ وفا کون دے گیا
راتوں کو جاگنے کی سزا کون دے گیا
کہنے سے ہو مَلال تو ہم کیا جواب دیں
تم کو نہ ہو خیال تو ہم کیا جواب دیں

دُنیا کرے سوال تو ہم کیا جواب دیں
تم کو نہ ہو خیال تو ہم کیا جواب دیں

پیار کا تحفہ

(اپنے جگری دوست یش بجربڑہ کی شادی کے موقع پر)

کارگر ہو گئی احباب کی تدبیر اب کے
مانگ لی آپ ہی دیوانے نے زنجیر اب کے

جس نے ہر دام میں آنے میں تکلّف برتا
لے اُڑی اُس کو زلفِ گرہ گیر اب کے

جو سدا حُسن کی اقلیم میں ممتاز رہے
دِل کے آئینے میں اُتری ہے وہ تصویر اب کے

خواب ہی خواب جوانی کا مقدّر تھے کبھی
خواب سے بڑھ کے گلے مِل گئی تعبیر اب کے

اجنبی خوش ہوئے اپنوں نے دُعائیں مانگیں

اس سلیقے سے سنواری گئی تقدیر اب کے

یار کا جشن ہے اور پیار کا تحفہ ہیں یہ شعر

خود بہ خود ایک دعا بن گئی تحریر اب کے

۲۷ر اگست ۱۹۷۰ء۔ دہلی

سمٹی ہوئی یہ گھڑیاں پھر سے نہ بکھر جائیں
اِس رات میں جی لیں ہم اِس رات میں مر جائیں

اب صبح نہ آ پائے آؤ یہ دُعا مانگیں!
اِس رات کے ہر پل سے راتیں ہی اُبھر جائیں

دُنیا کی نگاہیں اب ہم تک نہ پہنچ پائیں
تاروں میں بسیں چل کر دھرتی میں اُتر جائیں

حالات کے تیروں سے چھلنی ہے بدن اپنے
پاس آؤ کہ سینے کے کچھ زخم تو بھر جائیں

آگے بھی اندھیرا ہے پیچھے بھی اندھیرا ہے
اپنی ہیں وہی سانسیں جو ساتھ گزر جائیں

بچھڑی ہوئی رُوحوں کا یہ میل سُہانا ہے
اِس میل کا کچھ احساں جسموں پہ بھی کر جائیں

ترسے ہوئے جذبوں کو اب اور نہ ترساؤ
تم شانے پہ سر رکھ دو ہم باہ میں بھر جائیں

کس کا رستہ دیکھے اے دل اے سودائی
میلوں ہے خاموشی برسوں ہے تنہائی
بھولی دنیا کبھی کی، تجھے بھی مجھے بھی
پھر کیوں آنکھ بھر آئی

کوئی بھی سایہ نہیں راہوں میں
کوئی بھی آئے گا نہ باہوں میں
تیرے لئے، میرے لئے
کوئی نہیں رونے والا
جھوٹا بھی ناتا نہیں چاہوں میں
تو ہی کیوں ڈوبا رہے آہوں میں
کوئی کسی سنگ مرے
ایسا نہیں ہونے والا

کوئی نہیں جو یونہی جہاں میں
بانٹے پیر پرائی
کِس کا رستہ دیکھے .....

تجھے کیا بیتی ہوئی راتوں سے
مجھے کیا کھوئی ہوئی باتوں سے
سیج نہیں، چِتا نہیں
جو بھی ملے سونا ہوگا

لینا کیا ٹوٹے ہوئے ساتھوں سے
خوشی جہاں پائی تو نے
وہیں مجھے رونا ہوگا
نہ کوئی تیرا، نہ کوئی میرا
پھر کِس کی یاد آئی

نکلے تھے کہاں جانے کے لئے پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں
اب اپنے بھٹکتے قدموں کو منزل کے نشاں معلوم نہیں

ہم نے بھی کبھی اس گلشن میں اک خواب بہاراں دیکھا تھا
کب پھول جھڑے کب گرد اڑی کب آئی خزاں معلوم نہیں

دل شعلہ غم سے خاک ہوا یا آگ لگی ارمانوں میں
کیا چیز جلی کیوں سینے سے اٹھتا ہے دھواں معلوم نہیں

برباد وفا کا افسانہ ہم کس سے کہیں اور کیسے کہیں
خاموش ہیں لب اور دنیا کو اشکوں کی زباں معلوم نہیں

مرگھٹ کی سرزمین سے

میرے تصوراتِ کہن کی امیں ہے تو
مرگھٹ کی سرزمین مقدس زمیں ہے تو
اِک بے وطن اسیرِ محن کا سلام لے
آزردۂ بہارِ چمن کا سلام لے
فطرت ترے حرم پہ تقدّس نثار ہے
تو میرے دل کی خاک کی سرمایہ دار ہے

ویرانیاں تری مجھے جنت سے کم نہیں
یہ دھوپ مجھ کو سایۂ رحمت سے کم نہیں
گو تیرے راستوں میں ہر اک سُو ببول ہیں
دامن میں تیرے اس کی جوانی کے پھول ہیں

جو میری زندگی کی تمنّا بنی رہی
ذوقِ نیازِ روح کا کعبہ بنی رہی

حوریں ہیں تیرے پاک مناظر پہ گلفشاں
اے ارضِ شوق، اے مری اُمّید کے جہاں

مٹّی مہک رہی ہے تری رہ گذار کی
اُٹھی گئی ہے یاں سے عروسِ بہار کی

بھر بھر کے اشکِ دیدۂ خونناب بار میں
موتی بچھاؤں گا میں تری رہگذار میں

کندن سے کم نہیں مجھے راکھ اس دیار کی
دُنیا لُٹی ہے یاں میرے صبر و قرار کی

اِن گھاٹیوں میں اشک بہانے کے واسطے
آیا ہوں دل میں داغِ تمنّا لئے ہوئے
برباد حسرتوں کا سہارا لئے ہوئے

اے ارضِ پاک تجھ سے مرے دل کو ہے گلہ
تو نے مری اُمید کو کیوں راکھ کر دیا
کیوں میری زندگی کو جہنم بنا دیا

کیوں ایک بے گناہ کلی کو جلا دیا
کیوں مجھ سے میری روح کی تنویر چھن گئی
کیوں ایک حور آگ کے شعلوں کو سونپ دی

مجھ سے بھی انتظار کی زحمت نہ ہو سکی
محفوظ دو گھڑی وہ امانت نہ ہو سکی
اک بے وطن کے درد کا چارہ نہ ہو سکا
میں دیکھ لوں اسے یہ گوارا نہ ہو سکا

یہ دوپہر، یہ دھوپ، یہ ویران آسماں
تو ہی بتا کہ اب میں پکاروں کسے یہاں

کوثر میں وہ دھلی ہوئی باہیں بھی جل گئیں
جو دیکھتیں مجھے وہ نگاہیں بھی جل گئیں
عنبر سرشت گیسوئے شب گوں بھی جل گئے
وہ دیدہ ہائے مست پر افسوں بھی جل گئے

معصوم قہقہوں کا ترنم بھی مٹ گیا
جھینپی ہوئی نظر کا تبسم بھی مٹ گیا

اب میری آرزوؤں کی جنت یہ راکھ ہے

سرمایۂ حصولِ محبت یہ راکھ ہے
یہ میری شاعری کی کہانی کی راکھ ہے
یہ راکھ ایک پاک جوانی کی راکھ ہے
یہ راکھ میرے دِل کی تمنّا کی راکھ ہے
ذوقِ طلب کی جرأتِ تنہا کی راکھ ہے

اِس راکھ میں فلک کے ستاروں کا نور ہے
اِس راکھ میں زمین کی معصوم حور ہے
شعلے پھر ایک بار اسی راکھ سے اُٹھا
اور ختم کر دے میرے مصائب کا سلسلہ
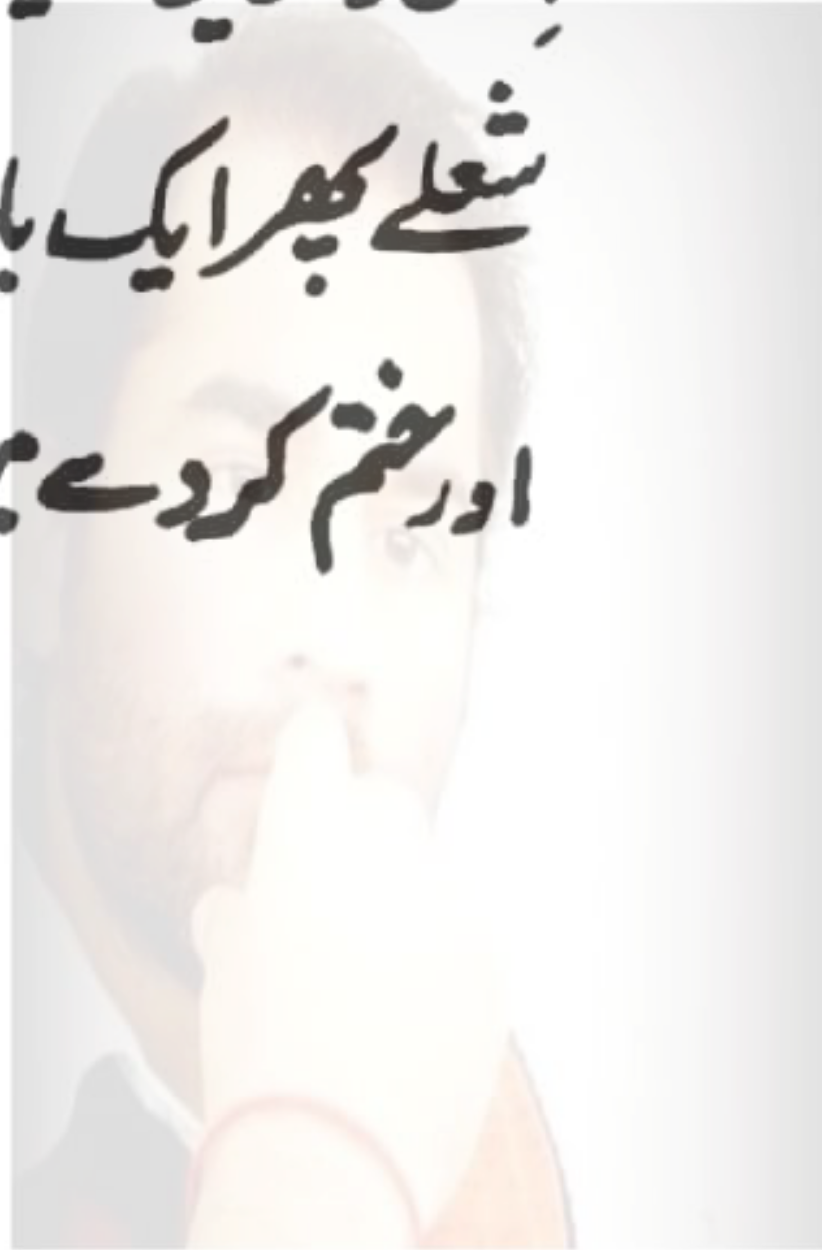
حُسن حاضر ہے محبّت کی سزا پانے کو
کوئی پتھّر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

مرے دیوانے کو اتنا نہ ستاؤ لوگو!
یہ تو وحشی ہے تمہیں ہوش میں آؤ لوگو!
بہت رنجور ہے یہ غموں سے چُور ہے یہ
خدا کا خوف کھاؤ بہت مجبور ہے یہ
کیوں چلے آئے ہو بس یہ ستم ڈھانے کو
کوئی پتھّر سے نہ مارے......

میرے جلوؤں کی خطا ہے جو یہ دیوانہ ہُوا
میں ہوں مجرم یہ اگر ہوش سے بیگانہ ہُوا
مجھے سولی پہ چڑھا دو کہ شعلوں میں جلادو
کوئی شکوہ نہیں جو جی چاہے سزا دو
بخش دو اس کو میں تیار ہوں مٹ جانے کو
کوئی پتھّر سے نہ مارے.........

پتھّروں کو بھی وفا پھول بنا سکتی ہے یہ تماشا بھی سرِعام دکھا سکتی ہے
لو اب پتھّر اٹھاؤ زمانے کے خداؤ تمہیں میں آزماؤں مجھے تم آزماؤ
اب دُعا عرش پہ جاتی ہے اثر لانے کو کوئی پتھّر سے نہ مارے.....

تجھ کو رکھے رام تجھ کو اللہ رکھے
دے داتا کے نام تجھ کو اللہ رکھے

شیخ، برہمن، مُلّا، پانڈے
سب ہیں اک ماٹی کے بھانڈے
وید وہی قرآن وہی ہے
رام وہی رحمان وہی ہے
کسی کا دامن تھام تجھ کو اللہ رکھے
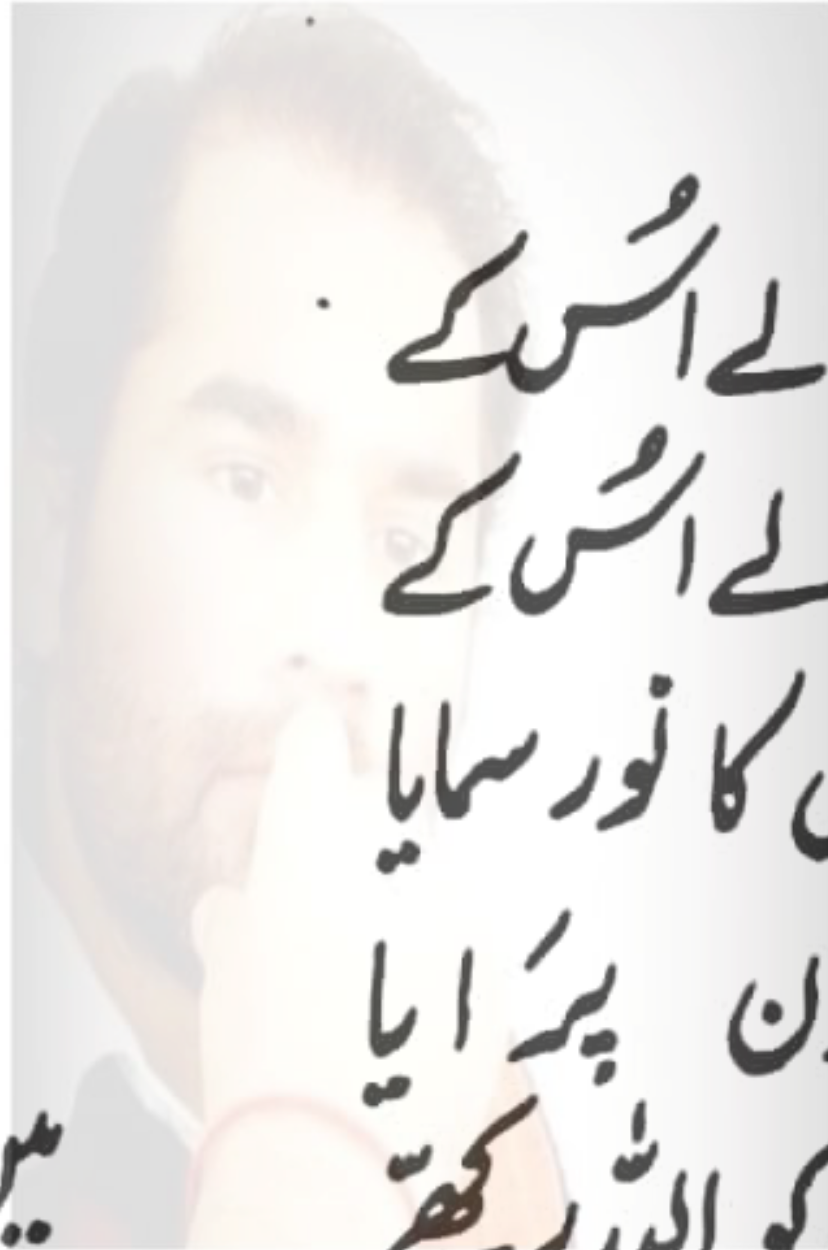
گورے اُس کے کالے اُس کے
پورب پچھم والے اُس کے
سب میں اُسی کا نور سمایا
کون ہے اپنا کون پرایا
سب کو کر پرنام تجھ کو اللہ رکھے

میں پردیس راہ نہ جانوں
بڑھتے غم کی تھاہ نہ جانوں
لوگ پرائے دیس بیگانہ
کہیں ملا نہ تیرا ٹھکانہ
صبح سے ہو گئی شام تجھ کو اللہ رکھے

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ یہ بدن یہ نگاہیں میری امانت ہیں
یہ گیسوؤں کی گھنی چھاؤں ہے مری خاطر
یہ ہونٹ اور یہ باہیں میری امانت ہیں
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے بجتی ہیں شہنائیاں سی راہوں میں
سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں میں
سمٹ رہی ہے تو شرما کے اپنی باہوں میں
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

کہ جیسے تو مجھے چاہے گی عمر بھر یوں ہی
اٹھے گی میری طرف پیار کی نظر یوں ہی
میں جانتا ہوں کہ تو غیر ہے مگر یوں ہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

"ساحر لدھیانوی اُن خوش قسمت شاعروں میں سے تھے جو کسی ممتاز نقّاد کے سہارے کے بغیر شہرت حاصل کرتے ہیں اور پھر تمام عمر شہرت کے اس ستارے کی روشنی ماند نہیں پڑنے دیتے۔ اُن کا شمار اُردو کے اُن معدودے چند شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی سادہ و دلنشیں شاعری کو عام لوگوں کے دلوں میں اتار دیا اور پھر عوام سے جو محبت حاصل کی اُسے زندگی بھر قائم رکھا۔"

ڈاکٹر انور سدید ______

" ساحر لدھیانوی صحیح معنوں میں جادوگر شاعر تھے۔ جو عزت اور اہمیت ہندوستان کی فلمی دنیا میں ساحر کو حاصل تھی پھر کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ ایک سچے اور فطری شاعر تھے۔ اُن کا مجموعہ "تلخیاں" بیسیوں بار شائع ہوا۔ اتنی مقبولیت اُس زمانے میں اردو کی کسی دوسری کتاب کو نہ ملی۔ تقریباً پچیس تیس برس تک ساحر فلمی دنیا کے مقبول ترین شاعر رہے۔"

——— ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

"ساحر یقیناً ایک اچھے شاعر تھے۔ ایک ایسے شاعر جسے سچائی کو شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر آتا تھا۔ اُن کے کلام کی گرفت صرف پڑھنے والوں پر نہیں لکھنے والوں پر بھی ہے۔ بعض اوقات اُن کا اثر وہاں بھی نظر آتا ہے جہاں اس کے ہونے کا کوئی ظاہری امکان بھی نہیں ہوتا۔"

——— پروفیسر نظیر صدیقی

تاریخ ساز رسالہ

فن اور شخصیت کا

مرتب : سریندر پرکاش معاون : کلیم راہی

نیاز فتح پوری کے بعد صابر دت دوسرے مدیر ہیں جن کی زندگی میں ان پر خاص نمبر شائع ہوا اور تاریخ میں پہلی بار ایک سو دس ادیبوں کی تحریریں بھی اس میں شامل ہوئیں۔

صابر دت نمبر میں چند ایسی تحریریں بھی شامل ہیں جس نے کئی قد آور ادبی شخصیتوں کے چہرے بے نقاب کردئے ہیں ساتھ ہی کچھ چونکا دینے والے انکشافات بھی ہوئے ہیں۔ جیسے شمس الرحمان فاروقی کا خیال ہے کہ صابر دت کی نظم "تاج محل" ساحر کی نظم "تاج محل" سے اچھی ہے۔ پروفیسر رالف رسل نے لکھا ہے کہ " زندگی بہت مختصر ہے۔ میں غالب اور میر کے علاوہ کچھ پڑھتا ہی نہیں۔"

۵۶۰ صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت دستاویزی نمبر جس میں آرٹ پیپر کے ۳۲ صفحات پر صابر دت کی تصویریں بھی شامل ہیں۔

ہند و پاک کے ہر مدیر سے درخواست کررہا ہے کہ اگر وہ کسی ادبی شخصیت پر خاص نمبر نکالنا چاہیں تو صابر دت نمبر کا مطالعہ ضرور کریں۔

قیمت ۔ تین سو روپے۔